اکائی: 1۔ اردو نظم نگاری کا فن

ساخت :

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 نظم کا تعارف

1.4 نظم کے موضوعات

1.5 نظم کی اقسام

1.6 نظم کی ہئیتیں

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات جوابات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

اردو ادب میں شاعری کو ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ شاعری سے مراد تمام شعری اصناف ہیں۔ مثلا غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ۔ ان میں نظم بحیثیت صنف اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ نظم کی مخصوص ہئیتیں ،موضوعات اور قسمیں ہوتی ہیں۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

۱۔ نظم کا مفہوم بیان کر سکیں

۲۔ نظم کے موضوعات پر تبصرہ کر سکیں

۳۔ نظم کی قسموں پر روشنی ڈال سکیں

۴۔ اہم نظموں کا خلاصہ بیان کر سکیں

munotes.in

1.2 تمہید

اردو شعری اصناف اپنے موضوعات، ہیئت اور فنی تقاضوں کی بنا پر جانی پہچانی جاتی ہیں اور منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ البتہ ان میں غزل کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ غزل اردو شاعری کی شان سمجھی جاتی ہے۔ اس کا چراغ ہر زمانے میں روشن رہا۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ غزل کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے اس کا ہر شعر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ایک نیا مضمون باندھا جا سکتا ہے۔ غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اردو شاعری میں غزل کے مدمقابل دوسری اہم صنف نظم ہے۔ جو کسی ایک موضوع پر تسلسل خیال اور اس کے اظہار کے لیے منفرد و ممتاز شناخت رکھتی ہے۔ نیز ہیئت کے اعتبار سے بھی جانی جاتی ہے۔ نظم ہر زمانے میں ذہنی کیفیت کی ترسیل کا ذریعہ بنی۔ اسی لیے شاہ سے گدا تک کی روداد نظموں کے توسط سے رقم کی گئی۔ ہر طرح کے جذبات و خیالات و کیفیات کو نظموں نے اپنے وسیع و عریض دامن میں سمیٹ لیا۔

قلی قطب شاہ نے مشترکہ تہذیب کی نمائندگی اور داخلی جذبات و احساسات کی عکاسی کے لیے نظمیں لکھیں۔ شمال میں بھی نظم نگاری کی صحت مند روایت موجود ہے۔ انجمن پنجاب لاہور کو نظم کے فروغ میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ 1874ء میں محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کی ایما پر تاریخی مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں مصرع طرح کے بجائے موضوع دیا جاتا تھا۔ حالی بھی اس مشاعرے میں شامل ہوئے۔ ظاہر ہے کہ حالی ادب میں افادیت کے قائل تھے۔ وہ تصنع، بناوٹ اور لفظی بازی گری کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے اس مشاعرے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسی طرح موضوعاتی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔

محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، امام بخش، مشرف بیگ دہلوی، کرشن لعل وغیرہ اہم نام ہیں جنہوں نے نظم کے ان مشاعروں میں عملی طور پر حصہ لیا۔ محمد حسین آزاد نے برسات، امید اور حب وطن جیسی بلند پایہ نظمیں پیش کیں۔ حالی نے نشاط امید، برکھارت، مناظرِ رحم و انصاف پیش کیں۔ یہ تمام نظمیں مخصوص مقصد کے تحت لکھی گئیں۔ اور انہیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ یہیں سے جدید نظم کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ فنی اور موضوعاتی سطح پر اس میں تجربے کیے گئے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق نے اردو نظم کی ترقی و ترویج میں اہم کردار نبھایا۔ غرضیکہ حالات و معاشرے کے مزاج و مذاق کے مطابق نظم میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی علی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز لکھنوی، ساحر لدھیانوی، ن۔م۔ راشد، میراجی، عمیق حنفی، ابن انشا، وزیر آغا اہم نظم نگار ہیں۔

1.3 نظم کا تعارف

نظم کے لغوی معنی لڑی میں موتی پرونا ہے۔اس سے انتظام، آرائش اور ترتیب کے معنی بھی لیے جاتے ہیں۔ لیکن اردو میں نظم دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔نظم سے مراد پوری شاعری ہے اور یہ نثر کے مدمقابل ہوتی ہے۔لیکن عام اور وسیع معنوں میں نظم وہ شعری پیکر ہے جس میں کسی ایک موضوع پر اظہار خیال تسلسل بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نظم میں ابتدا و ارتقا کا تصور ہوتا ہے۔طویل نظموں میں ارتقا بہت واضح ہوتا ہے۔البتہ چھوٹی نظموں میں واضح نہیں ہوتا ہے محض ایک تاثر ابھرتا ہے۔اس میں ہیت اور موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔نظموں کے موضوعات شاعروں کے طبعی میلانات اور ذوق طبع پر انحصار کرتے ہیں۔اس میں بڑی وسعت اور رنگارنگی ہوتی ہے۔

1.4 نظم کے موضوعات

صنف نظم موضوعات کے لحاظ سے متنوع، تہہ دار اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ نظموں میں ہر طرح کے موضوعات قلمبند کیے جاسکتے ہیں اور کیے گئے ہیں۔انسانی زندگی کے تمام واقعات، مسائل روزگار، انسانی فطرت، قدرت کے مناظر، چرند پرند، احساس و کیفیت، مٹتی ہوئی تہذیب اور بدلتی ہوئی قدریں غرضیکہ کوئی موضوع ہو، نظم کے روپ میں ڈھل سکتا ہے۔قلی قطب شاہ نے اپنے عہد کی مرقع کشی کے لیے نظموں کو وسیلہ بنایا۔اس کی نظموں میں قطب شاہی عہد کے رہن سہن، توہمات و عقائد، بادشاہ و عوام کے خوشگوار رشتے اور گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔نظیر اکبرآبادی نے عوامی کھیل تماشے، تہواروں، اہم شخصیات وغیرہ پر نظمیں لکھ کر اسے مزید استحکام بخشا۔انہوں نے مفلسی اور روٹیاں نظمیں لکھ کر انسانی ضرورتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔نظیر اکبرآبادی عوامی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی نظموں کے دو بند ملاحظہ کیجیے۔

روٹی نہ پیٹ میں ہو، تو پھر کچھ جتن نہ ہو　　میلے کی سیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے، غریب دل کی، خدا سے لگن نہ ہو　　سچ ہے کہا کسی نے کہ، بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہے روٹیاں　　(روٹیاں)

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی　　بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے ، جس پہ کہ آتی ہے مفلسی　　(مفلسی)

یہ نظیر اکبرآبادی کی دو بہترین نظموں کے دو بند ہیں۔جن میں کمزور طبقے کی پریشانیوں کا ذکر ہے اور ان کی داخلی کیفیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

علامہ اقبال بیسوی صدی کے بہت اہم شاعر گزرے ہیں۔انہوں نے نظم نگاری کے فن کو اوج ثریا تک پہنچا دیا۔ بلاشبہ علامہ اقبال کے سامنے نظم کے نمونے پہلے سے موجود تھے۔اقبال نے اپنی شاعری سے پورے ملک وقوم کو مخاطب کیا ہے۔ان کے یہاں فکر وفلسفہ نظر آتا ہے۔جسے وہ شعری جمالیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔اقبال خودی،خودداری، سربلندی اور بلند ہمتی کا پیغام دیتے ہیں۔وہ حرکت وعمل کے قائل ہیں اور ان تمام اوصاف کو انسانیت کی بقا کے لیے لازمی تصور کرتے ہیں۔علامہ اقبال نے مختلف النوع قسم کے موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔انہوں نے حرکت وعمل کے فلسفے کو بنیاد بنا کر نظمیں لکھیں۔اس کے علاوہ چھوٹے بچوں کے لیے، چرند پرند، پہاڑ اور گلہری، ہوا،موسم،مناظر فطرت،قدرتی بیل بوٹے وغیرہ پر بھی عمدہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ان کی نظم 'ہمدردی' ملاحظہ کیجیے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک　　ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ وزاری　　جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے　　کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری　　میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل　　چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے دنیا میں کوئی بھی چیز بے مقصد نہیں بنائی ہے۔ جگنو بظاہر بدرنگ اور چھوٹا سا کیڑا ہے لیکن اندھیرے میں چمکنے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ اس لیے جب بلبل اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے اپنے آشیانے تک پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے تو جگنو اس کی مدد کرتا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر بہت معنی خیز ہے۔ علامہ اقبال نے اس میں ایک پیغام دیا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی بہت ہی اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے مناظر فطرت کی تصویر کشی بہت ہی عمدہ طریقے سے کی ہے۔ انہیں سیاسی موضوعات سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے بڑے پر جوش اور اثر انگیز انداز میں سیاسی نظمیں لکھی ہیں۔ جوش کی آواز بڑی جاندار تھی۔ وہ بیک وقت شاعر شباب اور شاعر انقلاب کہلائے جاتے ہیں۔

برج نرائن چکبست لکھنو کے رہنے والے تھے اور انہیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ تھا۔ وطن کی محبت، آزادئ ہند کی تڑپ، ہندو مسلم اتحاد، قومی بیداری اور سماجی و سیاسی صورتحال کے نمایاں پہلو ان کی نظموں میں ملتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن جلد ہی نظم کی طرف مائل ہو گئے اور بحیثیت نظم گو مشہور ہوئے۔

اردو شاعری میں ایسے کئی نام ہیں جو موضوعات کے انتخاب میں جدت و ندرت رکھتے ہیں۔ شاعروں نے اپنے اپنے انداز و فکر اور طبیعی مناسبت سے نظمیں قلمبند کی ہیں۔ نیز معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات بھی موضوعات میں تبدیلی کا سبب بنتے ہیں۔ 1947، ایک ایسی تاریخ ہے جو ہر ہندوستانی کے ذہن و دل پر ثبت ہے۔ اس وقت کے تمام ہندوستانیوں کی اجتماعی کوشیشوں کا حاصل 'آزادی' تھی۔ لیکن ہندوستان، پاکستان کا بٹوارہ، ہجرت کے مسائل اور پھر فرقہ وارانہ فسادات نے ذہنوں کو غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ احساس ہوا کہ ہندوستانیوں نے آزاد ہند کے جو خواب بنے تھے، وہ ادھورے رہ گئے۔ فیض احمد فیض نے انہی خیالات و احساسات کو اپنی شہرہ آفاق نظم صبح آزادی میں پیش کیا ہے :

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر　　وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر　　چلے تھے یار کہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں

(صبح آزادی)

پوری نظم پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تاہم نظم میں ایک ہی خیال کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس نظم میں فیض یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم سب نے جس آزادی کے لیے کوششیں کی تھیں اس کی بنیاد خوشحالی، امن، انسانیت، اتحاد، محبت اور آپسی بھائی چارے پر رکھی گئی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد یہ ساری باتیں بے معنی ثابت ہو گئیں۔ اس لیے کہ محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ انسانیت جیسے فنا ہو گئی۔ خواب چور چور ہو گئے اور گنگا جمنی تہذیب کی روح معدوم ہو گئی۔ اس صورت حال سے

فیض مایوس وغمزدہ ہیں جس کا حاصل یہ نظم ہے۔

مخدوم محی الدین بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر تھے۔ انہیں سیاست سے گہرا لگاؤ تھا۔ مخدوم نے بہترین رومانی نظمیں لکھیں جن میں پاکیزہ اور سچے عشق کا تصور ہے۔ ان کی نظمیں انقلاب اور رومان کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کی نظمیں جلسوں اور جلوسوں میں گائی جاتی تھیں۔ مخدوم کا نام آزاد نظم کے فروغ کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ مسافر، چاند تاروں کا بن ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

اختر الایمان بھی ایک معتبر نظم گو شاعر گزرے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری میں فلسفیانہ تجسس کی کیفیت ملتی ہے۔ انہوں نے زمانے اور زندگی کے نشیب وفراز دیکھے ہیں، اچھے اور برے کا سامنا کیا ہے۔ ان کے یہاں نیکی اور بدی کی کشمکش، انسانی رشتوں کی حقیقت، وقت کی اہمیت، ماضی کی یادیں، خواب اور حقیقت میں تصادم جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی نظمیں محض بیانیہ یا براہ راست نہیں ہوتیں بلکہ صنعتوں کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ علامتیں، استعارے، رمز وایما، اشاریت وغیرہ ان کی خصوصیات ہیں اور یہ لوازمات حسن ودلکشی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی نظم 'ایک لڑکا' بہت ہی معروف ہے:

دیار شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کے مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
محروم چھینٹے کے وقت، راتوں کے اندھیروں میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں

یہ نظم بہت طویل ہے اور یہاں صرف چار اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ پوری نظم بچپن کی یادوں پر محیط ہے۔ ماضی کی خوشگوار یادیں، بچپن، نوجوانی، گاؤں اور وہاں کی اونچی نیچی سڑکیں، باغات، پھل، پھول، کھیت، منڈیر جھیلوں کا پانی، ٹھنڈی ہوا، چھٹپٹے کے وقت، اونچے ٹیلے، راتوں کے اندھیرے، ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا ایک لڑکا، کوئی اور نہیں اختر الایمان ہی ہے۔ اور یہ تمام وہ یادیں ہیں جس سے شاعر کو قلبی لگاؤ ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں بلند پایہ نظموں کی کمی نہیں ہے۔ ہر دور میں نظموں کی توسط سے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔اس صنف میں اتنی قوت ہے کہ تمام تر موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ نظم کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲۔ 'مفلسی' کس شاعر کی نظم ہے؟

۳۔ بلبل کو اس کے آشیانے تک پہنچانے میں کون مدد کرتا ہے؟

۴۔ اختر الایمان کی کسی ایک نظم کا نام بتائیے۔

1.5 نظم کی اقسام

نظم کی چار قسمیں ہیں۔ پابند نظم، معری نظم (بے قافیہ)، آزاد نظم اور نثری نظم

۱۔ پابند نظم :

پابند نظم سے مراد نظم کی وہ قسم ہے جس میں بحر، وزن، ردیف، قافیہ کی مکمل پابندی کی گئی ہو۔ اس میں اشعار کی تعداد کا تعین نہیں ہوتا ہے۔ یہ شاعروں کی طبیعت اور موضوع کے تقاضے پر منحصر کرتا ہے کہ اشعار کی تعداد کتنی ہے۔ نظم کی قسموں میں پابند نظم سب سے مقبول رہی ہے۔ بیشتر شعرا نے اس ہئیت میں نظمیں کہی ہیں۔ اسمعیل میرٹھی کی نظم 'صبح کا ترانہ' کے دو بند ملاحظہ ہوں :

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں پکارے گلے صاف چلا رہی ہوں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

munotes.in

۲۔ معریٰ نظم :

اسے بے قافیہ بھی کہتے ہیں۔جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہورہا ہے۔اس میں قافیے کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسے بلینک ورس (Blank Verse) کہا جاتا ہے۔اردو میں یہ ہئیت انگریزی سے آئی ہے۔ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی ہوتی ہے مصرعے بھی ہم وزن ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر محمد حسین آزاد کی نظم 'جغرافیہ طبعی کی پہیلی' ملاحظہ کیجیے :

ہنگامۂ ہستی کو گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک ترِ عالم صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گلکاری
اک رنگ کہ آتا ہے سو رنگ دکھاتا ہے

۳۔ آزاد نظم :

نظم بے قافیہ کی طرح آزاد نظم کی ہئیت بھی مغرب کی دین ہے۔انگریزی میں اسے 'فری ورس' کہا جاتا ہے۔اس میں ردیف و قافیے کی پابندی نہیں ہوتی۔البتہ کسی کسی شعر میں قافیہ کا استعمال ہوتا ہے جو شعری محاسن کا سبب بنتا ہے۔آزاد نظم میں بحر کی پابندی بھی نہیں کی جاتی ہے البتہ بحر کے ارکان کی پابندی الگ نوعیت سے کی جاتی ہے۔شمیم احمد اپنی تصنیف 'اصناف سخن اور شعری ہئیتیں' میں لکھتے ہیں :

> اردو کی آزاد نظمیں پوری طرح کسی نہ کسی بحر اور اس کے مخصوص وزن میں ہوتی ہیں۔صرف یہ ہوتا ہے کہ اختیار کردہ وزن کے ارکان کسی مصرعے میں زیادہ ہوتے ہیں، جس سے کہ وہ مصرعہ طویل ہو جاتا ہے، اور کسی مصرعے میں کم، جس سے کہ وہ مخصوص مصرعہ مختصر ہو جاتا ہے۔بحر اور اس کے وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔بہ الفاظ دیگر اردو میں وزن و بحر سے آزاد نظم کو آزاد نہیں کیا گیا۔ اس میں ارکان کی کمی بیشی کی ہی لچک پیدا کی گئی" (ص173)

تصدق حسین خالد ون -م-راشد، میراجی، ضیا جالندھری نے آزاد نظم لکھ کر شہرت حاصل کی ہے۔ میراجی کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے :

زرد چہرہ شمع کا ہے اور دھندلی روشنی
راہ میں پھیلی ہوئی،
اک ستون آہنیں کے ساتھ استادہ ہوں میں،
اور ہے میری نظر
ایک مرکز پر جمی
آہ! اک جھونکا صبا کا آ گیا
باغ سے پھولوں کی خوشبو اپنے دامن میں لیے (محبت)

۴۔ نثری نظم :

نثری نظم میں شاعری کی دیگر شرائط مثلاً ردیف، قافیہ، بحر، وزن، زمین کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ البتہ ان میں صوتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ بعض دفعہ شاعر اپنی ذوق طبع کی بنا پر یا غیر شعوری طور پر اس طرح کے کلام کہہ جاتے ہیں جن میں کسی جز کی پابندی کا گمان گزرتا ہے۔ انگریزی میں نثری نظم کو Prose Poetry کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں نثری داستانوں میں اسی طرح کی فنکاری ملتی تھی۔ رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" میں مقفیٰ نثر لکھنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ تاکہ نثر میں شاعری کا گمان گزرے۔ نثری نظم کی ایک مثال :

اگر
انسان کی
آنکھ نہ ہوتی
تو کائنات اندھی ہوتی (خورشید الاسلام)

mrunotes.in

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ نظم کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟

۲۔ صبح کا ترانہ کے مصنف کا نام بتایئے؟

۳۔ معریٰ نظم کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

۴۔ کیا پابند نظم میں اشعار کا تعین ہوتا ہے؟

1.6 نظم کی ہئیتیں

بعض علماء ادب کے مطابق اردو شاعری میں غزل کو چھوڑ کر باقی جتنی شعری اصناف ہیں سب ''نظم'' کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس خیال کے مطابق مثنوی، مرثیہ وغیرہ بھی نظم ہیں اور دیگر زبانوں سے درآمد کردہ اصناف سانیٹ، ترائیلے وغیرہ بھی نظم ہیں۔ اردو کے تمام شعری اصناف اپنی ہئیت اور موضوعات کے سبب ایک دوسرے سے مختلف ومنفرد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض صنف اپنی ہئیت کی وجہ سے جانی جاتی ہیں اور بعض اپنے موضوع کی وجہ سے اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ اردو نثری اصناف کو ہئیت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اول اردو کی عام ہئیتیں : ان میں مثنوی، رباعی، پابند نظم، قطعہ وغیرہ اہم ہیں۔

حصہ دوم : گیت، دوہا، ماہیا پر مشتمل ہے۔ ان کا سرا قدیم تہذیب وتمدن اور طور طریق سے، رسم وعقائد اور رہن سہن سے جڑا ہوا ہے اور یہ اصناف مقامی رنگ واثرات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔

ہئیت کے اعتبار سے تیسری قسم کی کڑی بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان میں معریٰ اور آزاد نظم، سانیٹ، ترائیلہ اور ہائیکو شامل ہیں۔

اردو شاعری میں مرثیہ اور قصیدو دو اہم اصناف ہیں۔ لیکن ان دونوں کی انفرادیت ان کے موضوعات میں مضمر ہے۔ ذیل میں اہم اصناف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ مثنوی :

مثنوی اردو کی قدیم بیانیہ صنف ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں دوہرا کیا ہوا، دودو والا۔ مثنوی کا ہر شعر دو قافیوں پر مشتمل اور ہر شعر کا قافیہ مختلف ہوتا ہے۔ مثنوی کے اشعار میں معنوی ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔ اس کا ہر

شعر زنجیر کی کڑی کی طرح دوسرے شعر سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ الطاف حسین حالی نے اپنی شاہکار تصنیف مقدمہ شعر وشاعری میں مثنوی کو سب سے کارآمد اور مفید صنف قرار دیا ہے۔ مثنویوں کے اشعار کا تعین نہیں ہوتا ہے اور عموماً یہ طویل ہوتی ہیں۔ مثنوی کی اجزائے ترکیبی میں ترتیب وار حمد ومناجات، مدح حاکم، تعریف شعر وسخن، سبب تالیف اور اصل قصہ ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں مثنوی واحد صنف ہے جن میں مافوق الفطرت عناصر کا بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی اس طرح کے واقعے بیان کیے جاتے ہیں جو فطرت سے بعید ہوتے ہیں اور جنہیں انسانی عقل قبول نہیں کرتی ہے۔ پریوں کے قصے کہانیاں، عشق کی داستانیں، ہجر ووصال، موتی، پھول، انگوٹھی وغیرہ کی تلاش، تبدیلیٔ قالب کا بیان وغیرہ اس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

اردو کی پہلی مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' فخر دین نظامی نے لکھی۔ وجہی نے شاہ کار مثنوی 'قطب مشتری' تحریر کی۔ وہ بلند پایہ شاعر ونثر نگار تھے۔ میر حسن کی مایہ ناز مثنوی 'سحر البیان' ہے۔ یہ مثنوی سادہ بیانی، جذبات نگاری، جزئیات کی عکاسی اور دلچسپ قصے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ بدر منیر، بے نظیر، نجم النساء، فیروز شاہ اس کے اہم کردار ہیں۔ دیا شنکر نسیم نے 'گلزار نسیم' لکھ کر مثنوی کی تاریخ میں بہترین اضافہ کیا۔ ایک طویل مدت تک مثنویاں لکھی جاتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی جارہی ہے۔

۲۔ مرثیہ :

مرثیہ مقبول وقدیم صنف ہے جو ہئیت کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کے سبب انفرادیت کی حامل ہے۔ یہ اصطلاح عربی زبان کے لفظ رثا سے بنی ہے۔ جس کے معنی رونے یا اظہار غم کرنے کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر کسی شخص کے دنیا سے اٹھ جانے پر اظہارِ غم کرتا ہے اور اس کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ ایسے مرثیے کو شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے۔ مرزا غالب نے مرثیۂ عارف، اقبال نے مرثیۂ داغ، چکبست نے مرثیہ گوکھلے لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کی وفات پر مرثیۂ غالب لکھ کر اپنی محبت کا اظہار کیا ہے جو فنی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ لیکن مرثیہ عام اور وسیع معنوں میں اس نظم کو سمجھا جاتا ہے جس میں حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا کا بیان کیا جائے۔ مرثیے کی ابتداء دکن میں ہوئی۔ اشرف بیابانی نے نوسر ہار لکھا۔ قلی قطب شاہ، ملا وجہی، عواضی وغیرہ نے خاصی تعداد میں مرثیے لکھے۔ شمال میں بھی مرثیے کی توانا روایت ملتی ہے۔ میر مستحسن خلیق و میر مظفر حسین ضمیر نے اس صنف کو مزید مستحکم کیا۔ انہوں

نے مرثیے کے اجزائے ترکیبی کا تعین کیا۔ یہ آٹھ اجزا چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین ہیں۔

اجزائے ترکیبی کے علاوہ مرثیے کی ہئیت بھی بہت اہم ہے۔ پہلے مرثیے کی باقاعدہ ہئیت نہیں تھی۔ سودا نے مرثیے کو مسدس کی ہیت دی۔ علامہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں لکھا ہے کہ

''سودا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مرثیے کو مسدس کی ہئیت میں لکھا۔''

اردو مرثیے میں انیس و دبیر کا مقام بہت بلند ہے۔ انیس کے مرثیوں میں واقعات نگاری، جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اپنے مرثیوں میں انیس نے کرداروں کی بڑی سچی اور اچھی تصویر کشی کی ہے۔ انیس کے ساتھ ہی دبیر کا نام آتا ہے۔ مرزا سلامت علی دبیر بہت اہم مرثیہ گو رہے ہیں۔ دبیر کے مرثیے شکوہ الفاظ، بلندیٔ خیال، پروقار علمی زبان، صنعتوں کے استعمال، نادر تشبیہات جیسی خصوصیات سے پر ہیں۔ ان معتبر و ممتاز مرثیہ گو شاعروں کے بعد بھی اس صنف کا سفر جاری رہا۔

۳۔ قصیدہ :

قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف (مدح) یا ہجو بیان کی گئی ہو۔ لیکن شاعروں نے دیگر موضوعات پر بھی قصیدے رقم کیے ہیں۔ قصیدہ عربی لفظ قصد سے بنا ہے۔ قصد کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ شاعر ارادہ کر کے پورے غور و فکر کے بعد اس کا حاصل پیش کرتا ہے۔ یہ واحد شعری صنف ہے جس کا تعلق راست طور پر دربار سے بھی ہے۔ عمدہ قصیدے کی پیشکش پر شاعروں کو انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا تھا۔ اس لیے اس صنف میں مقابلے کی گنجائش زیادہ ہوتی تھی۔

غزل کی طرح قصیدے کا پہلا شعر ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے اور اسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد کا تعین نہیں ہوتا ہے اور یہ ہر بحر میں لکھے جا سکتے ہیں۔

قصیدے کے چار اجزا ہوتے ہیں۔ تشبیب، گریز، مدح یا مذمت اور دعا۔ قصیدے کی ابتدا عربی، فارسی سے ہوتی ہوئی اردو میں داخل ہوئی۔ دکنی شعرا کے یہاں عمدہ قصیدوں کی وافر تعداد ملتی ہے۔ شمال میں مرزا محمد رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق اہم قصیدہ نگار گزرے ہیں۔

۴۔ رباعی :

رباعی اردو کی اہم صنف ہے جو ربع سے مشتق ہے۔ربع کے معنی چار کے ہیں۔اس طرح رباعی چار مصرعوں پر مشتمل نظم کو کہتے ہیں۔اسے دوبیتی اور ترانہ بھی کہا جاتا ہے۔رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور اس میں خیال کا تسلسل اور ارتقا پایا جاتا ہے۔چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے۔جس میں خیال اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔رباعی، چوتھے مصرعے کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہوتی ہے۔امجد حیدر آبادی کی ایک رباعی ملاحظہ کیجیے :

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز ، دوا کھاتے ہیں

اس رباعی میں امجد حیدر آبادی نے رزق حلال کی اہمیت اجاگر کی ہے۔حرام کی کمائی کا سب سے بڑا نقصان جو دنیا ہی میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔نہ صرف دعا بلکہ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔اس بات کو انہوں نے مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ دوا سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب مریض پرہیز بھی کرے۔اسی طرح عبادت بھی اسی وقت قبول ہوتی ہے جب بندہ حرام رزق سے پرہیز کرے۔رباعی بحر ہزج میں لکھی جاتی ہے اور اس میں ہر قسم کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، انیس، دبیر، جوش، فراق گورکھپوری، امجد حیدر آبادی وغیرہ اہم رباعی گو ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مافوق الفطرت کے کیا معنی ہیں؟

۲۔ میر حسن کی مثنوی کا نام بتائے۔

۳۔ قصیدے کے کتنے اجزا ہوتے ہیں؟

۴۔ میر انیس کسی صنف کے سبب جانے جاتے ہیں؟

1.7 خلاصہ

اردو ادب میں شاعری کو ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ شاعری سے مراد تمام شعری اصناف ہیں۔ مثلاً غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ۔ ان میں نظم بحیثیت صنف اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ نظم کی مخصوص ہئیتیں، موضوعات اور قسمیں ہوتی ہیں۔ نظم ہر زمانے میں ذہنی کیفیت کی ترسیل کا ذریعہ بنی۔ اسی لیے شاہ سے گدا تک کی روداد نظموں کی توسط سے رقم کی گئی۔ ہر طرح کے جذبات و خیالات اور کیفیات کو نظموں نے اپنے وسیع و عریض دامن میں سمیٹ لیا۔ قلی قطب شاہ نے مشترکہ تہذیب کی نمائندگی اور داخلی جذبات و احساسات کی عکاسی کے لیے نظمیں لکھیں۔ شمال میں نظم نگاری کی صحت مند روایت موجود ہے۔ انجمن پنجاب لاہور کو نظم کے فروغ میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ 1874ء میں محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر تاریخی مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوع دیا جاتا تھا۔ الطاف حسین حالی، امام بخش، مشرف بیگ دہلوی، کرشن لعل وغیرہ اہم نام ہیں جنہوں نے نظم کے اس مشاعرے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق نے اردو نظم کی ترقی و ترویج میں اہم کردار نبھایا۔ غرضیکہ حالات و معاشرے کے مزاج و مذاق کے مطابق نظم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

اردو کی تمام شعری اصناف اپنی ہئیت اور موضوعات کے سبب ایک دوسرے سے مختلف و منفرد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض اصناف اپنی ہئیت کی وجہ سے جانی جاتی ہیں اور بعض اپنے موضوع کی وجہ سے اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ شعری اصناف کو ہیت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول اردو کی عام ہئیتیں، جن میں مثنوی، رباعی، پابند نظم، قطعہ وغیرہ اہم ہیں۔ حصہ دوم گیت، دوہا، ماہیا پر مشتمل ہے۔ ان کا سرا قدیم تہذیب و تمدن اور طور طریق، رسوم و عقائد اور رہن سہن سے جڑا ہوا ہے اور یہ اصناف مقامی رنگ و اثرات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہئیت کے اعتبار سے تیسری قسم کی کڑی بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان معریٰ اور آزاد نظم، سانیٹ، ترائیلہ اور ہائیکو شامل ہیں۔ اردو شاعری میں مرثیہ اور قصیدہ دو اہم اصناف ہیں۔ لیکن ان دونوں کی انفرادیت ان کے موضوعات میں مضمر ہے۔

انسانی زندگی کے تمام واقعات، مسائلِ روزگار، انسانی فطرت، قدرت کے مناظر، چرند پرند، احساس و کیفیت ہٹتی ہوئی تہذیب اور بدلتی ہوئی قدریں غرضیکہ کوئی موضوع ہو نظم کے روپ میں ڈھل سکتا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بلند پایہ نظموں کی کمی نہیں ہے۔ ہر دور میں نظموں کی توسط سے معاشرے کی عکاسی کی گئی

ہے۔ اس صنف میں اتنی قوت ہے کہ تمام تر موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

(ا) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ قصیدہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

۲۔ نظم کی قسموں کا تعارف پیش کیجیے۔

۳۔ نظم ایک لڑکا کی انفرادیت کیا ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ علامہ اقبال کی نظم نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

۲۔ رباعی کی تعریف کرتے ہوئے امجد حیدر آبادی کی کسی ایک رباعی کی تشریح کیجیے۔

۳۔ اردو نظم کے بدلتے موضوعات کا محاسبہ کیجیے۔

1.9 فرہنگ

وافر	زیادہ
من وعن	جوں کا توں حرف بہ حرف
بسیط	کشادہ، وسیع
ترسیل	روانہ کرنا بھیجنا
بصیرت افروز	عقل کو روشن کرنے والی
مطمح نظر	مقصد، مرکز نظر
مدح	تعریف
معجزہ	وہ کام کرنا جو انسانی قوت سے باہر ہو
معتبر	جس پر بھروسہ کیا جا سکے

munotes.in

گدا	فقیر، بھکاری
تشبیب	عاشقانہ مضامین بیان کرتا
چین	نوحہ، مردے کی خوبیاں بیان کر کے رونا
مشعل	چراغ دان
حب وطن	وطن کی محبت
شجر	درخت
ہجو	برائی
تلاطم	موجوں کا زور، جوش

1.10 معاون کتابیں

۱	پروفیسر حنیف کیفی	اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم
۲	عنوان چشتی	اردو میں شاعری میں ہئیت کے تجربے
۳	علیم صبا نویدی	اردو شاعری میں نئے تجربے
۴	شمیم احمد	اصناف سخن اور شعری ہئیتیں

☆☆☆

munotes.in

اکائی: 2 ۔ اردو نظم نگاری کا ارتقا

ساخت:

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 اردو نظم (آغاز تا انجمن پنجاب)

2.4 انجمن پنجاب سے باہر اردو نظم، علی گڑھ تحریک

2.5 ترقی پسند تحریک

2.6 حلقہ اربابِ ذوق

2.7 خلاصہ

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

2.10 فرہنگ

2.11 معاون کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ:

☆ اردو شاعری میں نظم نگاری کی اہمیت وافادیت کو سمجھ سکیں۔

☆ نظم کے آغاز وارتقا پر معلومات حاصل کر سکیں گے۔

☆ ترقی پسند تحریک کے اردو نظم پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

☆ اردو نظم پر حلقہ اربابِ ذوق کے اثرات پر روشنی ڈال سکیں گے۔

munotes.in

2.2 تمہید

اصنافِ ادب میں اردو نظم ایک مقبولِ عام صنف ہے جو غزل اور دیگر اصناف سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ نظم جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں کہ یہ ایک عنوان کے تحت تخلیق کی جاتی ہے۔ شعری اصناف میں اردو نظم نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ایسی نظموں کی خاصی تعداد ملتی ہے جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں اور کسی خاص عنوان کے تحت تخلیق کی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ مثنوی کے زمرے میں شامل ہیں، کچھ قصیدے کے اور کچھ مسدس کے۔ نظم کے تحت کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ شاعر اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں تاہم ان کا بنیادی موضوع سے مربوط ہونا لازمی ہے۔ نظم میں صرف ایک ہی مرکزی خیال ہوتا ہے اور اس میں شامل تمام موضوعات اسی کے اردگرد دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک نظم میں کئی موضوعات پر اشعار کہے جا سکتے ہیں مگر اس میں بنیادی طور پر ایک ہی مرکزی خیال کے تحت تخلیق کردہ نظموں کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ نظم کے اجزائے ترکیبی میں ربط و تسلسل، حسنِ ترتیب، وضاحتِ بیان، جذبات نگاری، کردار، سچائی، فطرت اور زبان و بیان شامل ہیں۔ اس کی ہیئت مثنوی اور مسدس کے مماثل ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شاعری میں مغرب کے زیرِ اثر رہنے کے باوجود اردو نظم کا ہندوستانی تہذیب کی قدیم روایات سے نہایت گہرا رشتہ ہے۔ چنانچہ ان گوشوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے جو نظم کے ارتقا اور اس کے فروغ میں کارفرما رہے ہیں۔

2.3 اردو نظم (آغاز تا انجمن پنجاب)

اردو نظم کے آغاز و ارتقا کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ اس کی ابتدا شمالی ہندوستان میں ہوئی مگر اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ نظیر اکبرآبادی سے پہلے دکن میں اردو نظمیں لکھی جا چکی تھیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی 'چکی نامہ' پہلی موضوعاتی نظم ہے۔ عادل شاہی دور میں تخلیق کردہ نظمیں مذہب و اخلاق کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں قطب شاہی دور میں موضوعات کا تنوع بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ دکن میں اردو نظم کا عہد تقریباً چار سو سال پر مشتمل ہے۔ پہلی سلطنت بہمنی سلطنت تھی جو 1350 سے 1525 تک قائم رہی۔ بعد ازاں پانچ سلطنتیں وجود پذیر ہوئیں ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی سرپرستی میں مختلف ادبی نگارشات کی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ جہاں تک دکن میں اردو نظم کا تعلق ہے تو اس کے ابتدائی نقوش عہدِ بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں دکھائی دیتے ہیں۔ دکن میں اردو نظم کے موضوعات سے متعلق یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں مذہبی اور اخلاقی پند و نصائح کے ساتھ ساتھ صوفیانہ تصورات، عشقِ مجازی کی داستانیں، قدرتی مناظر کے علاوہ سماجی اور تہذیبی عوامل سے متعلق تمام تر

موضوعات پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ان میں میلے ٹھیلے،اور مختلف تہوار بھی شامل ہیں۔مزید برآں وطن سے محبت کا پیغام ان میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ان نظموں کی سماجی حقیقت نگاری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اربابِ ادب کے مطابق قلی قطب شاہ ایسا شاعر ہے کہ جس نے اردو نظم کو رومانوی پیکر میں ڈھال کر ایک نئی جہت عطا کی۔

شمالی ہند میں اردو نظم کا آغاز وارتقا سترہویں صدی میں ہوا۔ان میں افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔اسی دور کا شاعر جعفر زٹلی نہایت غیر سنجیدہ اور فحش الفاظ پر مبنی طرزِ بیان کا حامل تھا۔اربابِ ادب کے مطابق جعفر زٹلی کی شاعری کو تاریخی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کی شاعری مغلیہ دور کے انحطاط اور زوال کی تصویر نہایت پر اثر انداز میں پیش کرتی ہے نیز اس کی نظموں کو شمالی ہندوستان میں اردو نظم کی خشتِ اول کی حیثیت حاصل ہے۔اس نے مغل شہزادوں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی،اس دور کی سماجی بدحالی،تہذیبی انتشار اور معاشی بدحالی کو ہجویہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس کی نظموں میں شہر آشوب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ان میں دستور العمل در اختلافِ زمانہ ناہنجار، جنگ نامہ بہ وقتِ مردن عالم گیر اور طوطی نامہ نہایت اہم ہیں۔ناقدین کے مطابق ہزل اور زٹل کے باوجود جعفر زٹلی کو شمالی ہند میں اردو نظم کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔اس کی نظم نوکری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صاحب عجب بیداد ہے ،محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے، یہ نوکری کا خطر ہے
ہم نام کیوں اسوار ہیں، روزگار سیں بیزاری ہے
یارو ہمیشہ خوار ہیں ، یہ نوکری کا خطر ہے
نوکر فدائی خان کے،محتاج آدھے نان کے
تابع ہیں بے ایمان کے یہ نوکری کا خطر ہے (نوکری)

شمالی ہندوستان میں اردو نظم کا باقاعدہ ارتقا فرخ سیر (1713 تا1719) اور محمد شاہ (1719 تا1747) کے عہد میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس دور کے شعراء نے عوامی طرزِ تکلم کو اختیار کیا۔ان کے یہاں فارسی کی روش کی اقتدا کم یاب ہے۔ان شعراء میں صدرالدین فائز (1738) اور شاہ مبارک آبرو (1733) اور شاہ حاتم (1699۔1792) کو اردو نظم کے آغاز وارتقا میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔اس ضمن میں سید احتشام حسین کا نظریہ قابلِ ذکر ہے:

ایک حقیقت ہے کہ ولی کے ابتدائی دور میں جو نظمیں لکھی گئیں ۔وہ

مثنوی کے انداز میں بیانیہ قصے نہیں ہیں بلکہ مختلف خارجی اور داخلی موضوعات کے شاعرانہ موضوعات پر حاوی ہیں۔اگر فائز کے موضوعات زیادہ تر حسن سے تعلق رکھتے ہیں تو حاتم فلسفیانہ اور مفکرانہ موضوعات کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔فائز زیادہ تر داخلی یا رومانویت تاثرات کا ذکر کرتے ہیں تو حاتم خارجی حالات اور زندگی پر اثر کرنے والے مسائل بھی پیش کرتے ہیں۔فائز زیادہ تر مثنوی کی ہیئت سے کام لیتے ہیں تو حاتم ان میں بھی تجربہ کرتے ہیں۔چنانچہ انہون نے مخمس سے بھی کام لیا ہے۔

(جدید ادب منظر پس منظر:از احتشام حسین)

میر اور سودا کے یہاں کلاسیکی روایات کا عندیہ ملتا ہے تاہم ان کے کلام میں موضوعات کے تنوع اور بیان میں تسلسل کی بنیاد پر نظم کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اس دور میں اردو نظم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں سب سے اہم کردار نظیر اکبر آبادی کا ہے۔انہوں نے غزل کی ہیئت سے گریز کرتے ہوئے مسدس،مخمس،یا ترکیب بند اور ترجیع بند کے طرزِ بیان کو اختیار کیا۔ان کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی عناصر کے حامل عوامی زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں صوفیانہ اور حکیمانہ پیغام بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے ہندوستانی رسم ورواج اور زمینی مسائل کو نہایت اثر انگیز انداز میں پیش کیا۔نظیر اکبر آبادی کے یہاں موضوعات کا تنوع قابلِ ذکر ہے۔ان کی نظموں میں جہاں ناصحانہ پیغام جابجا ملتا ہے ساتھ ہی ساتھ منظر نگاری کی پیش کش نہایت دلفریب ہے۔ان کی نظمیں،بے ثباتی دنیا ،بڑھاپا،تندرستی نامہ،کرجگ،بنجارہ نامہ،ہنس نامہ،فنا نامہ،ٹھیلے خوانچے والوں کے لئے،تل کے لڈو،،ککڑی تربوز،کے علاوہ بازیگروں،مداریوں سبھی کے موضوعات کو اپنی نظموں میں سمویا ہے۔ان میں گلہری کا بچہ،ریچھ کا بچہ اور اژدھے کا بچہ بھی شامل ہیں۔نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے ارتقا میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو نظم کے آغاز وارتقا میں انجمنِ پنجاب کا بھی نا قابلِ فراموش کردار رہا ہے۔اس کا اصل نام انجمنِ اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب تھا۔بعد ازاں یہ انجمنِ پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔اس کا قیام 21 جنوری 1865 کو عمل میں آیا۔ڈاکٹر جی ڈبلیو لائیٹز،گورنمینٹ کالج لاہور کے پرنسپل اس کے صدر منتخب کئے گئے۔اس کے مقاصد کے پسِ پشت انگریز حکومت کے مفادات بھی شامل تھے ساتھ ہی ساتھ تعلیمی،اخلاقی اور اصلاحی مقاصد کے تحت اس کی سرگرمیاں منظرِ عام پر آتی رہتی تھیں۔اس انجمن کا اہم مقصد حکومت اور محکومین کے درمیان ایک خاص رشتہ قائم کرنا تھا۔محمد حسین آزاد اس انجمن کے صدر منتخب کئے گئے۔یہ انجمن ایک رسالہ شائع کرتی تھی جس کا نام تھا انجمن اشاعت مطالب،آزاد کو اس

رسالے کے اڈیٹر کی ذمہ داری دی گئی۔انجمن کے جلسوں میں آزاد کی تقاریر اردو شاعری کی اصلاح میں نہایت اہم مقام رکھتی ہیں۔19 اپریل 1874 میں انجمن کے اجلاس میں ان کی تقریر میں انہوں نے اردو شاعری کے کچھ کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی اور اصلاح کی غرض سے ایک نظم بعنوان شبِ قدر پیش کی۔کرنل ہالرائیڈ جو تعلیمی محکمے کے ڈائریکٹر تھے انہوں نے محمد حسین آزاد کی تجاویز کو لبیک کہا اور یہ طے پایا کہ انجمن کے زیرِ اہتمام ہر ماہ ایک مشاعرہ منعقد ہو جس میں طرحی مصرعے کے بجائے کسی عنوان کے تحت نظموں کی پیش کش کا اہتمام ہو۔پہلے مشاعرے کے لئے برسات کا عنوان طے پایا۔یکے بعد دیگرے ہر ماہ انجمن کے زیرِ اہتمام نظم نگاری پر مشتمل موضوعاتی مشاعرے کی تحریک کو تقویت ملی ۔کرنل ہالرائیڈ نے موضوعاتی مشاعرے کے انعقاد کی شروعات کی۔انجمنِ پنجاب کے تحت اردو نظم کے آغاز وارتقا میں محمد حسین آزاد کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان کا مضمون خیالات در بابِ نظم اور کلام موزوں اور مثنوی کے بارے میں ان کا خطبہ اردو نظم کے پیمانوں کو معین کرنے میں نہایت مددگار ثابت ہوا۔انہیں انجمن کے مشاعروں سے والہانہ دلچسپی تھی۔انجمن کے مشاعروں کی تعداد صرف 9 ہے۔10 مئی 1844 کو انجمن کا پہلا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حالی نے برکھارت نظم پڑھی۔ان مشاعروں میں پیش کردہ محمد حسین آزاد کی نظمیں ان کے شعری مجموعے نظمِ آزاد میں موجود ہیں ۔یہ نظمیں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔آزاد نے اپنی نظموں کے ذریعے فطرت نگاری کی بہترین مثال پیش کی۔ان نظموں میں صبح امید، حبِ وطن، خواب امن، دادانصاف، گنج قناعت، ابر کرم، زمستان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اسی طرح حالی کی نظم مناظرہ رحم وانصاف قابلِ ذکر ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا
کیا سب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے تری سخت تحیر ہے ہمیں
ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں
آنکھ میں تری مروت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ تجھ سے نہ دشمن کو میاں (مناظرہ رحم وانصاف)

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں آزاد اور حالی کے علاوہ متعدد دیگر قلم کاروں نے اپنی سخنورانہ کاوشیں انجام دیں ۔ان میں الطاف علی ،ذوق کاکوروی،انور حسین ہما،مرزا اشرف بیگ خاں اشرف ،منشی الٰہی بخش رفیق ،محمد مقرب علی، اموجان ولی دہلوی،(شاگردِ غالب) مولوی وقار بخش،مولوی علاء الدین محمد کاشمیری،مرزا عبداللہ بیگ مضطرب،مولوی عطااللہ خاں عطا، پنڈت کرشن لال طالب،مرزا رام داس قابل،منشی لچھمن داس برہم،مولوی سلطان علاالدین قریشی اور سید اصغر علی فقیر، ملا گل محمد عالی،مولوی فصیح الدین انجم،مفتی امام بخش رئیس وغیرہ کی بدولت اردو نظم باقاعدہ ارتقا پذیر ہوئی۔ان میں خواجہ الطاف حسین حالی کا مرتبہ سب سے بالاتر ہے۔اس انجمن کے ساتھ ساتھ دیگر مقامات پر اسی قسم کے اجلاس منعقد کئے گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ناقدین نے کس شاعر کو شمالی ہند میں اردو نظم کا پہلا شاعر قرار دیا ہے؟

۲۔ اردو نظم کی بنیادوں کو کس شاعر نے مستحکم کیا؟

۳۔ شمالی ہند میں کن شعرا کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں؟

2.4 انجمن پنجاب سے باہر اردو نظم، علی گڑھ تحریک

انجمن پنجاب کے زیرِ اثر دیگر علاقوں میں موضوعاتی نظموں کی تخلیق کے رجحان میں روز بروز اضافہ ہوا۔اس دور میں اسماعیل میرٹھی ،نظم طباطبائی اور سرور جہاں آبادی نے منظوم تراجم کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔سرسید احمد خاں،محمد حسین آزاد کی ان کاوشوں کے حامی تھے انہوں نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ

> میری نہایت قدیم تمنا اس مشاعرے سے برآئی۔میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں ۔آپ کی مثنوی خواب امن پہنچی دل بہت خوش ہوا۔
>
> (ڈاکٹر منظر اعظمی۔اردو ادب کے میں ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ،ص155،لکھنو،1996)

مزید برآں سرسید نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں بھی انجمن پنجاب کے مشاعروں کی حمایت کی تھی ۔ تہذیب الاخلاق کے کسی مضمون میں رقم طراز ہیں:

اردو زبان کے علم وادب کی تاریخ میں 1874 کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل
پوئٹری کا مشاعرہ ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔

(بحوالہ، مضامین تہذیب الاخلاق جلد دوم، ص۔555)

سرسید ادب برائے زندگی کے نظریے کے حامل تھے۔ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں فن کاروں سے قوم کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والی نظموں کی تخلیق پر زور دیتے تھے۔ وہ سماجی، اخلاقی اور سیاسی شعور کی آئینہ دار شاعری کے رجحان کو اہمیت دیتے تھے۔ علی گڑھ تحریک میں مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کے نظریے کی بھرپور نمائندگی کی۔ انہوں نے سرسید کی فرمائش پر ان کے زاویہ نگاہ پر مشتمل کئی نظمیں تخلیق کیں۔ ان میں مسدس مدوجزر اسلام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بایں ہمہ انہوں نے مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد اور مرثیہ غالب جیسی نظمیں لکھیں۔ انہوں نے انگریزی سے ماخوذ نظموں کی تخلیق کا کام بھی انجام دیا۔ ان میں عقل اور نفس کی گفتگو، قوم کی پاسداری، رؤسائے عہد کی فیاضی، شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ اور جواں مردی کا کام نے معاشرتی اصلاح کے نظریے کو نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا۔

اسی دور میں حالی کے ہم عصر شبلی نعمانی سرسید کے رفقائے کار میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک محقق، ادیب، نقاد اور انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب انداز میں جذبات کی عکاسی کرنے والے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے مروجہ سیاسی نظام کے خلاف طنزیہ نظریے کی حامل نظموں کی تخلیق کا کام انجام دیا۔ ان میں شہر آشوب اسلام، ہم کشتگانِ معرکہ کانپور، علمائے زندانی، مذہب یا سیاست، خطاب بہ اصرار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شبلی نعمانی کے علاوہ اکبرالہ آبادی طنز ومزاح کی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ سرسید احمد خاں کے مخالفین میں سے تھے۔ وہ ان کی مغرب پسندی کے خلاف تھے تاہم موضوعاتی شاعری کے نقطہ نظر کے حامی تھے اور ان کی قوم پرستی کے جذبے کے معترف تھے۔ انہوں نے نظم کے ارتقا میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی نظموں میں جلوہ دربار دلی، برقِ کلیسا اور دریا کی روانی نا قابلِ فراموش ہیں۔ یہ نیچرل شاعری کے نظریے کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں اس ضمن میں 'جلوہ دربارِ دہلی' کے مندرجہ ذیل اشعار قابلِ ذکر ہیں:

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

اس کے علاوہ اکبر نے ترجمے کا کام بھی انجام دیا ہے۔نظم 'دریا کی روانی' انگریزی نظم کا ترجمہ ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بلندی سے گرتا گراتا ہو ا　　نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا　　اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا　　زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا　　وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا　　وہ چکر میں گجرے پھنساتا ہوا

(بحوالہ کلیاتِ اکبر،ص۔187)

اکبر کی منظر نگاری اور روانی نظموں کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتی ہے

مولوی اسماعیل میرٹھی اس دور کے معروف شاعر رہے ہیں انہوں نے متعدد موضوعاتی نظموں کی تخلیق کا کام انجام دیا ہے۔اردو نظم کے ارتقا میں ان کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان کی نظموں کی جزیئات نگاری اور منظر نگاری کی خصوصیت آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔انہوں نے دیہی زندگی کے زمینی حقائق کو نظموں کی شکل میں پیش کیا۔مثال کے طور پر ہماری گائے،صبح کی آمد،برسات،شفق،پن چکی،کاشت کاری،تاروں بھری رات وغیرہ شاہکار نظمیں ہیں۔ان کی نظم 'صبح کی آمد' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں　　اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں　　پکارے گلے صاف چلا رہی ہوں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اسماعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں جو ان کی نظموں کا مجموعہ ریزہ ءِ جواہر میں شامل ہیں ۔مثال کے طور پر ایک قانع مفلس،موت کی گھڑی،فادر ولیم،حبِ وطن،انسان کی خام خیالی وغیرہ۔انہوں نے زیادہ تر بچوں کے لئے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ان کی نظم تاروں بھری رات Ann Taylor کی نظم Twinkle Twinkle Little Star کا ترجمہ ہے۔اس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو

تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
کہ اس اونچے آسمان پر
جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

یہ نظم، نظم معریٰ کے زمرے میں شامل ہے۔

ان ہی شعراء کے معاصرین میں علی حیدر نظم طبا طبائی کا نام اردو نظم کے ارتقا میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے ۔انہوں نے متعدد موضوعاتی نظمیں تخلیق کیں ۔مناظرِ قدرت کی پیش کش، اخلاقیات اور تاریخ ان کے خاص موضوعات میں شامل ہیں ۔ان کی نظمیں معنی اور فن کے اعتبار سے لطافت اور حقیقت نگاری کی ضامن ہیں ۔انہوں نے انگریزی شاعری کے اردو تراجم بھی کیے۔انہوں نے تھامس گرے کی نظم Elegy Written in Country Churchyard کا گورِ غریباں کے عنوان سے منظوم ترجمہ کیا جو ان کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔نظم طبائی کی ایک نظم 'برسات کی فصل' اس ضمن مین نہایت اہم ہے :

رت ہے برکھا کی ساون کی راتیں چل رہی ہے ہوا سائیں سائیں
ابر کرتا ہے گردوں سے باتیں آرہی ہے صدا سائیں سائیں

(بحوالہ نظم نظم طباطبائی، از نظم طباطبائی، مرتبین: امیر حسن، قمر حسن) ص۔129

علاوہ ازیں انہوں نے مغربی نظریات کے تحت نظم میں ہیئت کے جو تجربات کئے ان سے اردو نظم کے ارتقا کو خاطر خواہ فروغ ملا۔ان کے دیگر منظوم تراجم میں نغمہ زندگی، یادِ رفتگاں، دعوت زہر اور ہمدردی و ثابت قدمی وغیرہ ہیں۔

اسی دور میں اردو نظم کے ارتقا کا کارواں جن شعرا کے کارہائے نمایاں کے توسط سے آگے بڑھا ان میں نظر، سرور جہاں آبادی، اقبال، چکبست، نادر کاکوروی، مہر اور شرر کے نام نہایت اہم ہیں ۔مثال کے طور پر نظر کی شاعری میں جذباتیت کے ساتھ فکر کی بلندی اور منظر نگاری کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔انہیں رومانوی فکر کا حامل قرار دیا جا سکتا

ہے۔انہوں نے انگریزی نظموں کے تراجم کا کام انجام دیا۔ان کی نظمیں وطن کے جذ سے سرشار ہیں۔بہاروخزاں، یارانِ بے ہنگم اور گلاب کو ان کی شاہکار نظمیں قرار دیا جا سکتا ہے۔تیغِ ہندی، وطن دوستی اور سیتا جی۔۔وطن پرستی کی مثال ہیں۔ان کی بیشتر نظمیں مسدس کی ہیئت میں تخلیق کی گئی ہیں۔

درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا نام ناقابلِ فراموش ہے۔انہوں نے ہندوستانی عناصر، اساطیر اور مناظرِ قدرت کے علاوہ رسم ورواج اور دیگر موضوعات پر نہایت کامیاب نظمیں تخلیق کی ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع نہایت دیدہ زیب ہے۔غم خانہ سرور، پیمانہ سرور، خم کن سرور ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔ان کی نظموں میں یادِ طفلی، مہاراجہ دشرتھ کی بے قراری، پریاگ کا سنگم، سارس کا جوڑا، بچپن، سیتا جی کی گریہ وزاری، صحرا اور بیر بہوٹی، پدمنی لکشمی جی، نور جہاں، دربارِ اکبر، چتوڑ کی گزشتہ عظمت، یادِ وطن، شکوہ صیاد، لالہ لاجپت رائے، سوامی رام تیرتھ، شہرِ آشوب، ایک جلاوطن اور محب قوم کا گیت وغیرہ ہندوستانی قوم پرستی کی بہترین مثالیں ہیں۔ان کی ایک نظم میری کتابیں جو غم خانہ سرور میں شامل ہے، نہایت اہم ہے اس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں :

آہ میری کتابو، میرے بچپن کی رفیق
عالمِ طفلی سے ہو تم میرے بچپن کی رفیق
راحتِ دل ہو تمہیں آسائشِ جان ہو تمہیں
میری دنیا ہو تمہیں ، میرا ایماں ہو تمہیں

(بحوالہ غم خانہءسرور، سرور جہان آبادی، ص۔20 زمانہ پریس کانپور 1911)

اردو نظم کے ارتقا میں اقبال نے نئی جہت اور حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔انہوں نے ترکیب بند ہیئت کو برتتے ہوئے موضوعاتی شاعری میں ایک قسم کا تغزل پیدا کیا۔انہوں نے مغربی شعرا کے خیالات کو اپنی نظموں میں پیش کیا جنھیں انہوں بے ماخوذ نظموں کا نام دیا۔اس کے علاوہ انہوں نے منظوم تراجم کئے۔ان میں بچے کی دعا ہمدردی، ماں کا خواب، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ماں کا خواب، پیام صبح، عشق اور موت اور رخصت اے بزمِ جہاں وغیرہ نہایت اہم ہیں۔یہ نظمیں ان کے مجموعے بانگِ درا میں شامل ہیں۔اقبال نے قومی اور ملی موضوعات پر نظمیں تخلیق کیں۔ان میں سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہمالہ نیا شوالہ، تصویرِ درد، ہندوستانی

بچوں کا قومی گیت شامل ہے۔ان میں بیشتر بچوں کے لئےلکھی گئی ہیں ۔ان کی نظم' جگنو' موضوعاتی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ فنی زاویے سے بھی اہم ہے۔اس کے چنداشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جگنو کی روشنی ہے کا شانہ ءِ چمن میں | یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
یا آسماں سے آیا اڑ کر کوئی ستارہ | یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا | ذرہ ہے یا نمایاں پھولوں کی انجمن میں
یا شب کی سلطنت سے دن کا سفیر آیا | غربت میں اا کے چمکا گمنام تھا وطن میں

(بحوالہ بانگِ درا،اقبال)

اسی دور کے شعرا میں نادر علی کاکوروی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔انہوں نے بھی انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کئے۔وہ تراجم تخلیق معلوم ہوتے ہیں ان میں گزرے زمانے کی یاد، گھنٹہ نہیں بجے گا، آنسو، شاعر کا دل، مرحومہ کی یاد میں حسن کامل اور خواب نوشین وغیرہ فنی اعتبار سے نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

اردو نظم کے ارتقا میں پندت برج نرائن چکبست نے ہندوستان کی جاہ وعظمت کو پیش کرنے والی نظمیں تخلیق کی تھیں۔انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر متعدد ایسی نظمیں لکھیں ن جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان کی نظم' خاکِ وطن' جوان کے مجموعے صبح وطن مین شامل ہے،اس کے چنداشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اے خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے تھے جاری | چین وعرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری | چشم چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں | تاباں تھا مہر و دانش اس وادیِ کہن میں

(بحوالہ صبح وطن از برج نرائن چکبست 1985)

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ نظم طباطبائی کی نظم نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

2.5 ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کے ارتقا میں باضابط ایک نظام کی تشکیل دی ۔ترقی پسند تحریک نے ہندوستانی زندگی کے زمینی حقائق کو موضوعِ گفتگو بنایا ۔اس دور کے ناقدین نیا دبی زاویوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا ۔حالانکہ موضوعاتی شاعری کی باضابطہ شروعات آزاد اور حالی کے زمانے سے ہوگئی تھی ۔جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مفصل تذکرہ شامل ہے۔ترقی پسند شعری شعور سے متعلق ممتاز حسین رقمطراز ہیں:

> حقیقت کے اس نظریے نے ادب اور فن کی تخلیق کے نئے راز کھولے ہیں ۔یہاں ادب اور حیات دونوں ہی کے نظریے بدلے ہوئے ہیں۔۔۔انسانی عقل وفہم نے روح کے معنوی سایے کو مادے پر سے ہٹا دیا ہے ۔زندگی کی وہ تمام قوتیں جو روح کی جستجو میں مرتکز ہوگئی تھیں وہ آزاد ہوگئی ہیں ۔ادب انھیں قوتوں میں سے ایک ہے ۔اب یہ قوت تعمیرِ حیات میں کام دے رہی ہے ۔یہ کوئی انفرادی طاقت نہیں بلکہ سماجی طاقت ہے۔
>
> (بحوالہ جدید اردو نظم نظریہ وعمل، از پروفیسر عقیل احمد صدیقی ،2012 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

مذکورہ اقتباس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ترقی پسند زاویے کے تحت ادب میں سماجی مقاصد کے حصول کو ضروری قرار دیا گیا فن برائے فن کی بجائے ادب برائے زندگی کے نظریے کو اہمیت دی گئی ۔اس دور میں انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کے ساتھ حقیقت نگاری کی پیش کش میں تخیل سے کام لیا گیا اور عوامی موضوعات پر نظمیں تخلیق کی گئیں ۔اس دور میں اس وقت کے ہنگامی حالات کی پیش کش کے ساتھ ساتھ حب الوطنی ،انقلاب اور آزادی وطن کے نعرے بلند کرنے والی نظموں کی تخلیق کا کام کیا گیا ۔اس دور میں نظم کے ارتقا میں فروغ دینے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چند شعرا کا تذکرہ نہایت اہم ہے۔

مخدوم محی الدین ترقی پسند نظم کے ارتقا میں امتیازی اہمیت کے حامل ہیں ۔انہوں نے حیدرآباد کے شاہی زمانے میں انقلاب کی آواز بلند کی ۔انہیں محبت اور محنت دونوں کی شاعری کا علم بردار قرار دیا جاتا ہے ۔ان کی محبت کی نظموں میں سجدہ ،انتظار ،محبت کی چھاؤں ،نامہ حبیب ،وہ ،نورس ،چارہ گر اور چاند تاروں کا بن شاہکار نظمیں کہی جاتی ہیں ۔نظم چارہ گر کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں
مے کدوں کی درازوں نے دیکھا انہیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے

ترقی پسند شعرا میں علی سردار جعفری ایک منفرد مقام کے حامل رہے ہیں۔ وہ نہ صرف بلند پایہ شاعر تھے بلکہ ان کی ایک ممتاز نقاد کی حیثیت بھی مسلم ہے۔ نئی دنیا کو سلام ان کا شعری مجموعہ ہے۔ رومان سے انقلاب تک ان کی شاہکار نظم مانی جاتی ہے۔ ان کی نظم 'اردو' کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ہماری پیاری زبان اردو
ہماری نغموں کی جان اردو
زبان وہ دھل ہے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں کوئل سی کوکتی ہے

ترقی پسند تحریک کی فہرست میں کیفی اعظمی کا نام موضوعاتی نظموں کے حوالے سے اہم مانا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں عورت، تصور، دائرہ، نظریاتی سطح پر رومانوی طرزِ تکلم کے ساتھ ترقی پسند انقلاب کیا ہم مثال ہیں۔ 'عورت' نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شرر جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
حسن و عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج

ترقی پسند نظریے کے حامل فن کاروں میں ساحرلدھیانوی کا مام نا قابلِ فراموش ہے۔انہوں نے اشترا کی زاویہ نگاہ کی بھرپور عکاسی کی ۔ان کا مجموعہ تلخیاں جو 1971 میں دہلی سے شائع ہوا۔درد کی لہر اور گاتا جائے بنجارہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔انہوں نے فلوں کے گیت بڑی تعداد میں لکھے۔فلم پیسا ان کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔ان کی نظم تاج محل کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان کی ایک نظم 'شکست' کے چند اشعار دیکھیے:

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر ائے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

(بحوالہ تلخیاں،ساحرلڈھیانوی،ص۔24)

ترقی پسند شعرا کی فہرست میں اردو نظم کے ارتقا میں اسرالحق مجاز کا نام بھی نا قابلِ فراموش ہے۔ان کی شاعری انقلابی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ تغزل کی حامل ہے ۔ان کی نظمیں طفلی کا خواب،نذرِ دل ،نورا،کس سے محبت کروں، ایک غمگین یاد،آج کی رات،اندھیری رات کا مسافر،آہنگِ نو اور ریل ان کے جذباتی انداز کو پیش کرتی ہیں۔نذرِ علیگڑھ ان کی مشہور نظم ہے۔وہ اپنی شاعری میں نغمگی کے لئے معروف ہیں۔فیض احمد فیض نے انہیں انقلاب کا مطرب سے موسوم کیا۔ان کی نظم آوارہ کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربہ در مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ترقی پسند اردو نظم میں فیض احمد فیض کا نام اس حیثیت سے منفرد ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شاعری کے پیمانوں کو مدِ نظر رکھا۔انہوں نے نظم کی تخلیق میں غزل کی کیفیت پیدا کی ۔انہوں نے سماجی موضوعات کو عشقیہ پیرائے میں پیش کیا

۔ان کا کلیات نسخہ ہائے وفا کے نام سے شائع ہوا ان کی نظموں میں زنداں کی ایک صبح ،زنداں کی ایک شام،ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے،لیلیٰ وطن، دلِ بیتاب ٹھہر،ہم دیکھیں گے کے علاوہ بیشتر نظمیں ہیں جو ترقی پسند انقلاب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ان کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ کے چند اشعار یہ ہیں :

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غم ،دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

ان سب کے علاوہ ترقی پسند شعرا جنہوں نے اردو نظم کے ارتقا میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں اختر الایمان ، جاں نثار اختر ،احمد ندیم قاسمی ،،شاد عارفی ،منیب الرحمٰن اور ظہیر کاشمیری کے علاوہ وامق جونپوری اور حفیظ جالندھری کے نام خاص طور پر اہم ہیں جن کا ذکر ایک اکائی میں کرنا ناممکن ہے ۔انہوں نے موضوعاتی نظموں کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔حفیظ جالندھری شاہنامہ اسلام کی تخلیق کے حوالے سے خاص طور معروف ہیں ۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ترقی پسند تحریک اردو شاعری پر کس طرح اثر انداز ہوئی ؟

۲۔ ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی پر نوٹ لکھیے ۔ ا

2.6 حلقۂ اربابِ ذوق

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 1939 میں اس مقصد کے تحت عمل میں آیا کہ چند ادبی ذوق کے حامل شعرا اپنی تخلیقات پر ایک دوسرے کی رائے کا اظہار کریں گے ۔اس کے بانیوں میں نصیر احمد جامعی اور شیر محمد اختر کے نام اہم ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ قیوم ظفر اور یوسف ظفر نے اس کے اجلاس میں نظمیں پڑھیں ۔اس حلقے کے ممبروں میں بیدی ہنس راج رہبر،کنہیا لال کپور اور بیگم محمود کا نام اہم ہیں۔اس حلقے میں میرا جی نے ترقی پسند نقطہ نظر کے خلاف آواز بلند کی اور ادب برائے زندگی کے زاویے کی بجائے فن برائے نظریے کو فوقیت دی۔حلقہ اربابِ ذوق نے جدید نظموں پر مشتمل نظموں کا انتخاب 1941 مین شائع کیا۔اس میں صرف 24 نظمیں تھیں جن مین ترقی پسند شعرا کی نظمیں بھی شامل تھیں

munotes.in

۔ان کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

ازلی مسرتوں کی ازلی منزل (احمد ندیم قاسمی)، انتباہ (فیض احمد فیض)، خودکشی (ن۔م۔راشد)، تو گر واپس نہ آئی (جوش)، جواب تغافل (عدم)، ننھا قاصد (اختر شیرانی)، ڈرائنگ روم (سلام مچھلی شہری)، تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے (مطلبی فرید آبادی)، انوکھا پیار (مخمور جالندھری)، دشہرا اسنان (شاد عارفی)، دھوبی کا گھاٹ (میرا جی)، نقشِ پا (اختر الایمان)، جنت کی سیر (مہدی علی خاں)، رقص (یوسف ظفر)، خاکے (وشوامتر عادل) وغیرہ۔ یہ نظمیں رسائل میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

1941ء کی بہترین نظموں کی اشاعت کے بعد دوسرا نظموں کا انتخاب 1942 میں منظرِ عام پر آیا۔اس میں اشتراکی فلسفہ، جنسی مسائل جو انسان کے لاشعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں، کے ساتھ ساتھ نسوانی مسائل اور خواتین کی آزادی پر گفتگو کی گئی۔ تعلیمِ نسواں ان کے موضوعات میں شامل رہا۔میراجی کے مطابق تصوراتی دنیا کے توسط سے انسان کے انفرادی اور داخلی مسائل کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کی مثالیں میراجی، مختار صدیقی، انجم رومانی اور تصدق حسین خالد کے کلام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اس ضمن میں میراجی کے نظریے کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔وہ اس نظم میں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری زندگی ماہ بہ ماہ نہیں تو سال بہ سال ضرور بدلتی جارہی ہے اور یوں نہ صرف سماجی اور اقتصادی حالات ادب پر اثر انداز ہورہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی طور پر بھی خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات ادب اور آرٹ میں جہاں فن کاری کے لئے اسلوب قائم کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

(بحوالہ اردو نظم نظریہ و عمل از عقیل احمد صدیقی، ص۔187)

حلقہ ارباب کے نظریے کی ترجمانی کرنے والوں میں میراجی پیش پیش رہے۔ان کی ایک نظم چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں جو ان کی نظم تفاوت راہ سے ماخوذ ہیں:

اس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ
گلے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
بھولے رستوں کا جو بے دھیانی میں کھو جاتے ہیں

ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا دھیان آتا ہے
ہر ستارہ مجھے لے جاتا ہے

میراجی حلقہ اربابِ ذوق کے ایسے شاعر تھے کہ جن کی نظموں کی پوری فضا ہندوستانی ہے۔ان کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اخلاقی اقدار کی پاسداری کا زیادہ شعور نہیں رکھتے تھے۔ان کے یہاں شعری ابہام بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کے نظریے کی نمائندگی میں ن۔م۔راشد کا نام نا قابلِ فراموش ہے۔انہوں نے اردو نظم میں جدت طرازی کا کام انجام دیا۔ن۔م۔راشد کے نزدیک:

> جدید شاعری ،کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔فارم کی جکڑ بندیوں سے اردو شاعری کو آزاد کرنا اور دوسرے شاعر ی کو معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا۔

(بحوالہ جدید اردو نظم نظریہ وعمل،عقیل احمد صدیقی،ص۔175)

ن۔م۔راشد کی نظم 'اسرافیل' کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
مرگِ اسرفیل سے
اس جہاں میں بند آوازوں کا رزق
مطربوں کا رزق اور سازوں کا رزق
اب مغنی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا
سننے والوں کے دلوں کا تار چپ
اب کوئیر قاص، کیا تھرکے گا لہرائے گا کیا

ن۔م۔راشد نے آزاد نظم کے تحت قدیم اور جدید قواعد وضوابط کے توسط سے ایک نئی راہ ہموار کی۔وہ ایک مصرعے میں سوال قائم کرتے ہیں تو دوسرے میں جواب تلاش کرتے ہیں۔

حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا میں مختار صدیقی کا نام نہایت اہم ہے۔انہوں نے فسادات سے متعلق نظمیں تخلیق کیں جن میں بازیافتہ نظم کو ان معنوں میں امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسی عورت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس کو اغوا کرلیا گیا

munotes.in

تھا۔ بعد میں وہ بچ جاتی ہے مگر اس کی زندگی کے مسائل اب بھی ختم نہیں ہوتے۔ اس نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اچھا خاصا سبک سا نقشہ
چہرہ پیلا لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو
تنہا تنہا بلا ارادہ

یوسف ظفر حلقہ اربابِ ذوق کے ایسے شاعر ہیں کہ جن کی نظموں میں جذباتیت کے انداز میں مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی نظمیں رنگ گفتگو، انارکلی، وادی نیل کے علاوہ شکایت سوالی اور خبر ان کے نظریے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی نظم وادی نیل کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جمال مرگ آفریں، یہ شب میری زندگی ہے
نچوڑ دے اس کے چند لمحوں کی عشرتوں میں
وہ مے وہ نشہ کہ ساغر ماہ وصال میں ہے

علاوہ ازیں حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا میں ضیا جالندھری بھی اپنے زاویے کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی نظم 'وقت کاتب ہے' کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

وقت کاتب ہے تو مسطر چہرے
جس سے تحریر شناسی میری تقدیر ہوئی
وہ معانی پس الفاظ نظر آتے ہیں
جن کو پہچان کے دل ڈرتا ہے

اس کے علاوہ تنہا، بڑا شہر، آنسو وقت کاتب ہے، ادھوری خود فریب، تسلسل، کہی ان کہی، دروغ گو راوی اور پیغام کے علاوہ ضیا جالندھری کی بیش تر نظمیں ہیں۔

اس طرح حلقۂ اربابِ ذوق نے کلاسیکی روایات کو برقرار رکھنے اور نظم میں جدت طرازی کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔

munotes.in

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ حلقہءارباب ذوق کے اردو نظم سے متعلق نظریے کی وضاحت کیجئے۔

۲۔ حلقہءارباب ذوق کے تحت تخلیق کردہ نظموں میں سے چند اشعار لکھئے

۳۔ میراجی سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجئے۔

2.7 خلاصہ

شعری اصناف میں اردو نظم نہایت اہمیت کی حامل ہے۔قدیم زمانے میں بھی ایسی نظموں کی خاصی تعداد ملتی ہے جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں اور کسی خاص عنوان کے تحت تخلیق کی گئی ہیں۔ان میں سے کچھ مثنوی کے زمرے میں شامل ہیں، کچھ قصیدے کے اور کچھ مسدس کے۔نظم کے تحت کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ شاعر اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کرتا ہے۔اس میں ایک سے موضوعات بھی ہو سکتے ہیں تاہم ان کا بنیادی موضوع سے مربوط ہونا لازمی ہے۔نظم میں صرف ایک ہی مرکزی خیال ہوتا ہے اور اس میں شامل تمام موضوعات اسی کے اردگرد دکھائی دیتے ہیں۔اردو نظم اس حقیقت کی حامل ہے کہ یہ مغرب کے زیرِ اثر وجود میں آئی تاہم اردو شاعری کی قدیم روایات سے اس کے گہرے رشتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اردو نظم کے آغاز وارتقا کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ اس کی ابتدا شمالی ہندوستان میں ہوئی مگر اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا آغاز نظیر اکبرآبادی سے پہلے دکن میں اردو نظمیں لکھی جا چکی تھیں۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی چکی نامہ پہلی موضوعاتی نظم ہے۔عادل شاہی دور میں تخلیق کردہ نظمیں مذہب واخلاق کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔علاوہ ازیں قطب شاہی دور میں موضوعات کا تنوع بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔دکن میں اردو نظم کا عہد تقریباً چار سو سال پر مشتمل ہے۔پہلی سلطنت بہمنی سلطنت تھی جو 1350 سے 1525 تک قائم رہی۔بعد ازاں پانچ سلطنتیں وجود پذیر ہوئیں ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی سرپرستی میں مختلف ادبی نگارشات کی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔جہاں تک دکن میں اردو نظم کا تعلق ہے تو اس کے ابتدائی نقوش عہدِ بہمنی ،قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں دکھائی دیتے ہیں۔دکن میں اردو نظم کے موضوعات سے متعلق یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں مذہبی اور اخلاقی پن ونصائح کے ساتھ ساتھ صوفیانہ تصورات، عشقِ مجازی کی داستانیں، قدرتی مناظر کے علاوہ سماجی اور تہذیبی عوامل سے متعلق تم تر موضوعات پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ان میں میلے ٹھیلے، اور مختلف تہوار بھی شامل ہیں۔اس دور میں اردو نظم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں سب سے اہم کردار نظیر اکبرآبادی کا ہے۔انہوں نے غزل کی ہیئت سے گریز کرتے ہوئے مسدس، مخمس، یا ترکیب بند اور ترجیع بند کے طرزِ بیان کو اختیار کیا۔ان کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی عناصر

کے حامل عوامی زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں صوفیانہ اور حکیمانہ پیغام بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے ہندوستانی رسم ورواج اور زمینی مسائل کو نہایت اثر انگیز انداز میں پیش کیا۔نظیر اکبر آبادی کے یہاں موضوعات کا تنوع قابلِ ذکر ہے۔

اردو نظم کے آغاز وارتقا میں انجمنِ پنجاب کا نا قابلِ فراموش کردار رہا ہے۔اس کا اصل نام انجمنِ اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب تھا۔بعدازاں یہ انجمنِ پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی،اس کا قیام 21 جنوری 1865 کو عمل میں آیا۔ڈاکٹر جی ڈبلیو لائیٹز، گورنمینٹ کالج لاہور کے پرنسپل اس کے صدر منتخب کئے گئے۔اس کے مقاصد کے پس، پشت انگریز حکومت کے مفادات بھی شامل تھے ساتھ ہی ساتھ تعلیمی، اخلاقی اور اصلاحی مقاصد کے تحت اس کی سرگرمیاں منظرِ عام پر آتی رہتی تھیں۔اس انجمن کا اہم مقصد حکومت اور محکومین کے درمیان ایک خاص رشتہ قائم کرنا تھا۔انجم پنجاب کے زیرِ اثر دیگر علاقوں میں موضوعاتی نظموں کی تخلیق کے رجحان میں روز بروز اضافہ ہوا۔اس دور میں اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی اور سرور جہاں آبادی نے منظوم تراجم کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اس دور میں اردو نظم کے ارتقا میں اقبال نے نئی جہت اور حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔انہوں نے ترکیب بند ہیئت کو برت تے ہوئے موضوعاتی شاعری میں ایک قسم کا تغزل پیدا کیا۔انہوں نے مغربی شعرا کے خیالات کو اپنی نظموں مین پیش کیا۔انہوں بے ماخوذ نظموں کا نام دیا۔اس کے علاوہ انہوں نے منظوم تراجم کئے۔ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کے ارتقا میں باضابط ایک نظام کی تشکیل دی۔ترقی پسند تحریک نے ہندوستانی زندگی کے زمینی حقائق کو موضوعِ گفتگو بنایا۔اس دور کے ناقدین نیا دبی زاویوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔حالانکہ موضوعاتی شاعری کی باضابطہ شروعات آزاد اور حالی کے زمانے سے ہوگئی تھی ۔جیسا کہ گزشتہ سفحات میں مفصل تذکرہ شامل ہے۔ترقی پسند اردو نظم میں مخدوم محی الدین، زور علی سردار جعفری، کیفی اعظمی ،ساحر لدھیانوی، مجاز وغیرہ کے علاوہ فیض احمد فیض کا نام اس حیثیت سے منفرد ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شاعری کے پیمانوں کو مدِ نظر رکھا۔انہوں نے نظم کی تخلیق میں غزل کی کیفیت پیدا کی۔انہوں نے سماجی موضوعات کو عشقیہ پیرائے میں پیش کیا۔حلقہ ءِ اربابِ ذوق کا قیام 1939 میں اس مقصد کے تحت عمل میں آیا کچند ادبی ذوق کے حامل شعرا اپنی تخلیقات پر ایک دوسرے کی رائے کا اظہار کریں گے۔اس کے بانیوں میں نصیر احمد جامعی اور شیر محمد اختر اہم ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ قیوم ظفر اور یوسف نظر نے اس کے اجلاس میں نظمیں پڑھیں۔اس حلقے کے ممبروں میں بیدی ہنس راج رہبر ،کنہیا لال کپور اور بیگم محمود کا نام اہم ہیں۔اس حلقے میں میراجی نے ترقی پسند نقطہ نظر کے خلاف اواز بلند کی اور ادب برائے زندگی کے زاویے کی بجائے فن برائے نظریے کو فوقیت دی۔حلقہ اربابِ ذوق نے جدید نظموں پر مشتمل نظموں کا انتخاب 1941 مین شائع کیا۔اس میں صرف 24 نظمیں تھیں جن مین ترقی پسند شعرا کی نظمیں بھی شامل

تھیں۔1960 تک تمام مروجہ رجحانات اردو نظم پر حاوی رہے مگر اب ایک ایسا رجحان منظرِ عام پر آیا کہ جس نے اردو شاعری کی سمت ہی بدل دی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں کسی بھی رجحان کو تحریک کی شکل حاصل نہیں رہی ہے۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں سب سے زیادہ اہمیت کن شعرا کو حاصل تھی؟

۲۔ ادب کے تئیں سرسید کا کیا نظریہ تھا؟

۳۔ ترقی پسند شعرا کس مغربی فلسفی سے متاثر رہے ہیں؟

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ شمالی ہند میں انجمنِ پنجاب اور اردو نظم پر روشنی ڈالئے۔

۲۔ انجمن پنجاب سے باہر اردو نظم پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو نظم کے نمائندہ شعرا پر ایک نوٹ لکھئے۔

۴۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے نمائندہ شعرا سے متعلق نوٹ لکھئے۔

2.9 فرہنگ

لاشعور	پوشیدہ
اکتساب	حاصل کرنا
تذکرہ	ذکر
شکستہ	ہارا ہوا، ٹوٹا ہوا
حقائق	سچائیاں
داخلی	اندرونی
ماخوذ:	لیا گیا
شناس:	جاننے والا

2.10 معاون کتابیں

احتشام حسین	عکس اور آئینے
انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں
حنیف کیفی	نظمِ معری اور آزاد نظم
سید طلعت حسین نقوی	نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی جائزہ
داؤد اشرف	مخدوم ، ایک مطالعہ
عبدالحق مولوی	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ
عقیل احمد صدیقی	اردو نظم نظریہ و عمل
شمیم احمد	اصناف سخن اور شعری ہیئتیں
اقبال	بانگِ درا
منظر اعظمی	اردو ب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانات کا حصہ
وزیر آغا	نظمِ جدید جی کروٹیں
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	انتخاب نظیر اکبر آبادی
کلیاتِ اکبر	اکبر الہ آبادی

☆☆☆

munotes.in

اکائی: 3۔ اختر الایمان

ساخت:

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 اختر الایمان کا عہد

3.4 اختر الایمان کی حیات وشخصیت

3.5 اختر الایمان کی ادبی خدمات

3.6 اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات

3.7 (الف) منتخب نظم کا تجزیہ

(ب) منتخب بند کی تشریح

3.8 خلاصہ

3.9 نمونے کے امتحانی سوالات

3.10 فرہنگ

3.11 معاون کتابیں

munotes.in

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ اختر الایمان کی زندگی سے واقفیت حاصل کریں گے۔ مطالعہ سے آپ کو اختر الایمان کی ادبی کاوشوں اور ادب میں اُن کے مقام کے تعین میں آسانی ہوگی۔ نیز مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے اور جان سکیں گے کہ :

☆ اختر الایمان کے حالاتِ زندگی کیا تھے۔

☆ اختر الایمان کی ادبی خدمات کیا تھیں۔

3.2 تمہید

اس اکائی میں اختر الایمان کے سوانحی کوائف اور ان کی نظم نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ جدید شاعری میں اختر الایمان کا مرتبہ ایک نئے لہجے کے شاعر کا ہے۔ وہ اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں فرد اور سماج کا ٹکراؤ اور انسانی رشتوں کی پامالی کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے شاعروں سے ہٹ کر اپنی پہچان بنائی۔ بظاہر وہ حلقۂ ارباب ذوق سے متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کی آواز اپنی آواز ہے۔ اس اکائی میں اختر الایمان کی زندگی اور ان کے فن پر تفصیل سے اظہار کیا گیا ہے۔

3.3 اختر الایمان کا عہد

اختر الایمان نے مشقِ سخن شروع کی تو اقبالؔ کی دلفریب، پر رعب اور پر جلال آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ جوشؔ کی شعلہ نوائی اور گرم گفتاری ایک پوری نسل کو متاثر کر رہی تھی۔ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے غنائی لہجے کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔ عظمت اللہ خاں، ن۔م۔ راشد اور میراجی وغیرہ نے اپنے لیے ایک پگڈنڈی الگ چنی، ایک نیا قافلہ، نئی آواز اور نیا ہمہمہ لے کر سامنے آیا جس میں فیض، مجاز، جذبی، مخدوم اور سردار جعفری وغیرہ شامل تھے، یہ ترقی پسندوں کا کارواں تھا۔ دہلی میں استاد حیدرؔ دہلوی، پنڈت امرناتھ سحرؔ، نواب سائل دہلوی اور استاد بیخودؔ کے شاگردوں کی ٹولیاں کہیں جامع مسجد کے چوک اور ایڈورڈ پارک کے لان میں بیٹھی ادبی رسہ کشی میں مصروف نظر آتی تھی۔ مصرعوں پر تابڑتوڑ گرہ لگانا اور فی البدیہہ شعر کہنا ہی شاعری کی معراج سمجھی جاتی تھی اور شاعری کا موضوع بھی زلف ورخسار کی داستان ہجر اور وصال کے قصّے، عاشق اور رقیب کی کشمکش، محبوب کے جور و جفا کا رونا وغیرہ تھے۔ ایسے ماحول میں اختر الایمان نے شاعری شروع کی اور صرف گرداب کی اشاعت کے بعد اپنے منفرد لب و لہجے سے اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دور اردو شاعری کی دنیا میں نئی دریافتوں، نئے تجربوں اور نئے لہجوں کا دور تھا۔

اختر الایمان نے اپنے زمانے کے شعرا سے اثر قبول کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا مخدوم، مجاز، فیض اور سردار جعفری سے بھی اور حلقۂ اربابِ ذوق سے منسلک ن۔م۔ راشد، میراجی، یوسف ظفر، تصدق حسین خالد، مجید امجد اور قیوم نظر سے بھی۔ لیکن اُن پر کسی مخصوص مکتبِ فکر کی چھاپ نہیں۔ اُنھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ترقی پسندیت کے شوق میں ادب کو پروپیگنڈا بنا کر جمالیاتی قدروں کا خون نہیں کیا۔ میراجی سے اختر الایمان بہت متاثر تھے اُن کے اوّلین مجموعہ کلام گرداب کا دیباچہ بھی میراجی اور مختار صدیقی نے مل کر لکھا تھا۔ وہ دور صرف ادبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی ہر اعتبار سے ناگفتہ بہ حالات سے دوچار تھا، عالمی تناظر میں آپسی خانہ جنگی سے

ماحول خراب ہو چکا تھا۔ بڑی طاقتوں کے درمیان سبقت حاصل کرنے کی کشمکش ایک جنگ عظیم کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں تحریکِ آزادی سب سے اہم اور فعال شکل میں نمودار ہو چکی تھی۔ اقتصادی طور پر پسماندہ طبقات نہ صرف یہ کہ منظم ہو رہے تھے بلکہ ان میں جارحانہ رجحانات نیا مزاج کے مقابل کھڑی انہی قوتوں کے پہلو بہ پہلو مارکسی نظریات کے مبلغین بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ایسے پر آشوب دور میں شعر و ادب کی دنیا میں بہ یک وقت کئی بلند قامت ہستیاں ابھر کر سامنے آئیں۔ بلند قامت ہستیوں کے اس ہجوم میں صفوں کو چیرتے ہوئے آگے پہنچ جانا آسان کام نہیں تھا لیکن اختر الایمان نے یہ کام کر دکھایا۔

اختر الایمان کی شاعری کو پڑھنے کے معنی اپنے عہد کے انسانوں کے ان عادات و خصائل کو بخوبی جاننے کے ہیں جن میں بغض، حسد، ریا، مکر، مایوسی، سرد مہری، بے حسی، خود غرضی، حرص، آزار جیسے کردار کی نمایاں ہیں۔ اختر الایمان انہی معنوں میں سب سے بڑے حقیقت پسند معلوم ہوتے ہیں کہ انھوں نے تمام موجود لسانیاتِ شعری کو آزمانے کے بجائے دوٹوک اور حقیقی زبان کا استعمال کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ شاعری کا ایک طرز یہ بھی ہوتا ہے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ اختر الایمان کی شاعری کی ابتداء کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔

۲۔ اختر الایمان کے دورِ شاعری میں دیگر شعراء کی شاعری کے متعلق معلومات لکھیے۔

3.4 اختر الایمان کی حیات و شخصیت

راؤ کھیڑی، ریاست اتر پردیش کے ضلع بجنور کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں زیادہ تر مسلمان راجپوتوں کی آبادی ہے۔ اختر الایمان کے آباواجداد راجپوت تھے۔ اُن کے آباواجداد میں سے کسی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اختر الایمان کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا لیکن پیار سے لوگ انھیں بالے راؤ کہتے تھے، ان کا کپڑوں کا کاروبار تھا اور گڑھوال میں اُن کی دکان بھی تھی۔ دادا کے انتقال کے وقت اختر الایمان کے والد کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ ورثے میں کپڑے کی دکان اور ایک مکان آیا لیکن اختر الایمان کے چچا مولا بخش نے مکان اور دکان دونوں پر قبضہ جما لیا تھا۔

اختر الایمان جمعہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو قلعہ پتھر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ پتھر گڑھ اختر الایمان کا ننھیال ہے۔ ان کا بچپن کا دور خانہ بدوشانہ رہا۔ امامت کے سلسلے میں ان کے والد ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جایا کرتے۔ پھر وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ جہاں انھیں یتیم خانہ موید الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ایک اسکول بھی تھا۔

اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں موید الاسلام کے اساتذہ کا بڑا حصّہ رہا، اس کے بعد انھوں نے فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں اختر الایمان نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

اپنی شاعری کی ابتدا اختر الایمان نے اسی یتیم خانے سے کی جو کہ ایک اسکول بھی تھا۔ بقول اختر الایمان اُن کی شاعری کا محرک اشفاق نام کا ایک آدمی تھا، جس کے بال سرخ اور رنگ گورا تھا اور جو دلی کی گلیوں میں اپنی شاعری گا گا کر کتاب کی شکل میں چھاپ کر بیچا کرتا تھا، اُسے دیکھ کر اختر الایمان کو خیال گزرا کہ ایسا شعر تو میں بھی کہہ سکتا ہوں اور پھر انھوں نے غزلیں کہنا شروع کر دیں، فتح پوری مسلم ہائی اسکول کی میگزین میں اُن کی نظم گورغریباں چھپی اور یہی سے اُن کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد انھوں نے اینگلو عربک کالج کا رخ کیا۔ اس کالج کے طالب علم رہتے ہوئے اختر الایمان نے غیر تدریسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔

اختر الایمان جب راؤ کھیڑی میں آنے جانے لگے اور اسکول میں ہی تھے کہ ان کی والدہ کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگی لیکن اختر الایمان کسی طرح بھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی والدہ کو بار بار سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ ہی تعلیم پوری ہوئی ہے اور نہ باضابطہ ازدواجی زندگی گزارنے کے اسباب فراہم ہیں، لیکن والدہ نے ان کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور پکڑ دھکڑ کر ان کی شادی سلیمن نام کی ایک لڑکی سے کر دی گئی۔ سلیمن ان کی والدہ کا بھی نام تھا، اس لیے اختر الایمان اپنی بیوی کو سلمٰی کہتے تھے، ازدواجی زندگی کا سلسلہ آگے بڑھ بھی نہ پایا تھا کہ منقطع ہو گیا۔

اینگلو عربک کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد اختر الایمان یہیں سے ایم اے کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی غیر تدریسی سرگرمیوں کے باعث پرنسپل ان سے خوش نہیں تھے اس لیے انھیں وہاں داخلہ نہیں ملا۔ چنانچہ اختر الایمان کا سلسلۂ تعلیم تعطّل کا شکار ہو گیا، اسی زمانے میں ساغر نظامی کی خواہش پر ۱۹۴۱ء میں ایشیا کی ادارت کے سلسلے میں میرٹھ چلے گئے لیکن چند ماہ بعد دہلی واپس لوٹ آئے اور ۱۹۴۲ء میں دلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے لیکن یہ ملازمت بھی جلد چھوٹ گئی۔ اپنے تعلیمی سلسلے کو دوبارہ شروع کرنے کی غرض سے علی گڑھ چلے آئے۔ رشید احمد صدیقی اور شاہد احمد دہلوی کے تعاون سے ایم اے اردو میں داخلہ لیا وہ پہلے سال امتیازی نمبروں سے کامیاب بھی ہوئے لیکن مستقل آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا یہ سلسلہ ترک کرنا پڑا۔

۱۹۴۴ء میں حیدرآباد کانفرنس سے اختر الایمان پونہ آئے یہاں اُن کی ملاقات ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد سے ہوئی۔ انھوں نے اختر الایمان کو فلم جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ اختر الایمان نے فوراً ان کی درخواست پر شالیمار اسٹوڈیو جوائن کر لیا اور اس طرح فلموں سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں اُن کی ملاقات کرشن چندر اور رامانند ساگر سے ہوئی۔ یہاں

اختر الایمان نے کئی فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں ان میں تین چار اہم ہیں غلامی (کرشن چندر کے ساتھ)، سنجوگتا، میرا، جو ریلیز نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک اور دھارمک کہانی کرشن بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن مکمل نہیں ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت اختر الایمان شالیمار (پونے) میں تھے۔ حالات جب ناگفتہ بہ ہو گئے اور ترکِ وطن کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈبلیو۔ زیڈ احمد بھی پاکستان چلے گئے اور شالیمار بند ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اختر الایمان بھی بمبئی چلے آئے اور فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے، منظر نامے اور اسکرین پلے وغیرہ لکھنے شروع کئے اور تاحیات یہیں رہے۔ اختر الایمان کے پریتما داس گپتا اور بیگم پارہ سے اچھے مراسم رہے پریتما داس گپتا کی فلم جھرنا اختر الایمان نے ہی لکھی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے اسی ہولناک ماحول میں اختر الایمان کا سلطانہ منصوری سے نکاح ہوا۔ سلطانہ منصوری قومی رہنما بیرسٹر آصف علی کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اختر الایمان چند دنوں بعد بمبئی چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بمبئی میں ابتدائی دنوں میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ثابت قدمی سے حالات پر رفتہ رفتہ قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے فلموں میں کہانیاں مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے میں اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ان کا نام چوٹی کے رائٹرز میں لیا جانے لگا۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی حصّہ ہو جہاں اختر الایمان نہ گئے ہوں۔ شاعروں، سیمیناروں اور فلم کی مصروفیات کے سلسلے میں وہ ملک کے تقریباً ہر حصّہ میں جا چکے ہیں۔ وہ اردو کے چنندہ ایسے شاعروں میں ہیں جنھیں بیرون ملک کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی بار جون ۱۹۶۷ء میں بیروت میں افرو ایشیائی کانفرنس کے سلسلے میں وہ ملک سے باہر گئے، اس موقع پر انھوں نے دمشق اور ماسکو کا بھی سفر کیا، لندن، پیرس اور قاہرہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس لوٹے۔ ۱۹۷۰ء میں فلم سفاری کے لیے انھیں کینیا، تنزانیہ، یوگانڈا اور نیروبی جانا پڑا۔ فیروز خاں کی فلم اپرادھ کی شوٹنگ جرمنی میں ہوئی مکالمہ نگار کی حیثیت سے وہ بھی جرمنی گئے اور پھر کام ختم ہونے پر برلن، جنیوا اور روم ہوتے ہوئے ہندوستان واپس ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں مشاعروں کے سلسلے میں ان کا نیویارک، لاس اینجلس، سان فرانسسکو، ڈزنی لینڈ اور شکاگو جانا ہوا، واپس ہوتے ہوئے انھوں نے فرانکفورڈ، قاہرہ، دوبئی اور کراچی میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے قیام کیا۔ ۱۹۸۵ء میں اپنے ۷۰ رسالہ جشن میں شرکت کے لیے وہ ٹورنٹو گئے۔

اختر الایمان نے بمبئی میں ۵۰ سالہ قیام کے دوران تقریباً ۱۰۰ فلموں میں منظر نامے اور مکالمے لکھے، جن میں نغمہ، رفتار، زندگی اور طوفان، مغل اعظم، قانون، وقت، داغ، آدمی، مجرم، شبنم، ضمیر، آدمی اور انسان اور اپرادھ بے حد مشہور ہوئے۔ اُن کے کل ۱۰ مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا شعری مجموعہ گرداب جو ۱۹۴۳ء میں چھپا اس کے بعد تاریک سیارہ (۱۹۴۶ء)، سب رنگ (۱۹۴۸ء)، آبِ جو (۱۹۵۶ء)، یادیں (۱۹۶۱ء)، بنت لمحات (۱۹۶۹ء)، نیا آہنگ (۱۹۷۷ء)، سروسامان (۱۹۸۳ء)، زمین زمین (۱۹۹۰ء)، زمستاں سرد مہری (۱۹۹۷ء) اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

اختر الایمان کو کئی اعلیٰ اور پروقار ایوارڈ اور اعزازات بھی ملے۔ ۱۹۴۲ء میں انھیں یادیں پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ بنت لمحات پر اتر پردیش اردو اکیڈیمی اور میرا کیڈیمی نے انعامات سے نوادا۔ نیا آہنگ پر مہاراشٹر اُردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔ سروساماں پر حکومت مدھیہ پردیش نے اقبال سمّان سے نوازا اور اسی مجموعہ پر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور اُردو اکیڈیمی دہلی نے بھی اعزازات دیے۔

جنوری ۱۹۸۶ء سے طویل علالت کے دوران انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح لکھی۔ آخر کار زندگی اور موت کی کشمکش میں ۹/مارچ ۱۹۹۶ء بروز سنیچر کو اختر الایمان کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی اور ۱۰/مارچ ۱۹۹۶ء کو باندرہ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ اختر الایمان کی خانگی زندگی کے بارے میں لکھیے۔

۲۔ اختر الایمان کی فلمی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ اختر الایمان کی علالت، علاج اور آخری وقت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔

3.5 اختر الایمان کی ادبی خدمات

اختر الایمان اردو نظم کے نئے معیارات متعین کرنے والے منفرد شاعر ہیں جن کی نظمیں اردو ادب کے سرمایہ کا لاثانی حصّہ ہیں۔ اُن کا بچپن خانہ بدوشی میں گذرا۔ اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں موید الاسلام اور یہاں کے اساتذہ کا بڑا حصّہ رہا ہے۔ یہاں کے ایک استاد عبدالواحد نے اختر الایمان کو لکھنے، پڑھنے اور مقرری کی طرف توجہ دلائی اور انھیں احساس دلایا کہ ان میں ادیب اور شاعر بننے کے بہت امکانات ہیں۔ انہی کی حوصلہ افزائی سے اختر نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی۔

اختر الایمان کا شمار جدید اردو نظم کے اہم شعرا میں ہوتا ہے جہاں ایک طرف ان کی نظمیں موضوع، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے شعری دنیا میں انفرادیت کی حامل ہیں تو وہیں دوسری طرف ان کی نثری تصنیف اس آباد خرابے میں خودنوشت نگاری کی روایت میں بلا شبہ گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آباد خرابے میں، ایک ایسے فرد کی داستان ہے جس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے کتنے سرد و گرم برداشت کیے قدم قدم پر مسائل و مصائب کا سامنا کیا۔

اختر الایمان نے اپنے دوست محمود ایاز کی فرمائش پر اپنی زندگی کے واقعات لکھ کر ان کے پاس بھیجے جو رسالہ سوغات میں قسط وار شائع ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہو کر یہ کتاب 'اس آباد خرابے میں' کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ پندرہ ابواب پر مشتمل یہ خودنوشت وہ رودادِ حیات ہے جس میں اختر الایمان کی زندگی کے تمام گوشے شخصیت کے منفی و مثبت پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ دیگر آپ بیتیوں کی طرح اپنی پیدائش، مقام اور خاندانی حالات وغیرہ کے براہِ راست بیان کے بجائے اختر الایمان افسانوی انداز میں خودنوشت کا آغاز کرتے ہیں مثلاً رات کا وقت عبداللہ پور جمنا نگر کا اسٹیشن، پلیٹ فارم پر جلتی ہوئی مٹی کے تیل کی لالٹین، مصنف کی غنودگی اور کانوں میں آتی ابّا کی آواز وغیرہ افسانے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ یہ خودنوشت اختر الایمان کی پیدائش، تعلیم و تربیت آباواجداد، والدین، عزیز و اقارب، دوست و رشتہ دار، استاد وغیرہ کے متعلق تفصیلات بہم پہنچاتی ہے۔ یہ کتاب کسی باقاعدہ پلان کے تحت وجود میں نہیں آئی تھی اس لیے واقعات میں بے ربطی اور تکرار کا معاملہ سامنے آتا ہے اور بعض مقامات پر تسلسل کی کمی کھٹکتی ہے مگر موضوع اور فنی اعتبار سے یہ خودنوشت ایک کامیاب اور یادگار کہی جاسکتی ہے۔

اختر الایمان کا پہلا شعری مجموعہ 'گرداب' 1943ء میں شائع ہوا جس میں 22 نظمیں ہیں۔ دوسرا مجموعہ کلام 'تاریک سیارہ' 1952ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں 44 نظمیں ہیں۔ اس کے بعد 'آب جو' 1959ء اور 'یادیں' (31 نظمیں) 1961ء میں شائع ہوئے۔ 'بنت لمحات' 42 نظموں پر مشتمل مجموعہ کلام 1969ء میں شائع ہوا۔ پھر 1947ء میں 'نیا آہنگ' (21 نظمیں)، 'سروسامان' 1983ء جو 35 نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ایک طویل نظم 'جیونی' بھی ہے جو 9 حصوں پر مشتمل ہے۔ 'زمین زمین' 1990ء (26 نظمیں)، 'زمستاں سرد مہری کا' 1997ء (34 نظمیں) ہیں۔

مجموعہ کلام 'گرداب' کے بعد اختر الایمان کی ایک نظم 'پل پل روپ بھرے' 1948ء میں شائع ہوئی تھی اور 1943ء میں ایک ناٹک 'سب رنگ' شائع ہوا۔ اس ناٹک میں جنگل کی دنیا ہے اور اس کے کردار جانور ہیں۔

3.6 اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات

ترقی پسند تحریک نے اپنے پچیس سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمایے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اسے اگر تخلیق ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصّہ نارسیدہ اور ناتراشیدہ ہونے کے سبب سے ناقابل التفات قرار پائے گا اور چند مخصوص شعرا کا کلام ہی باقی رہے گا جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے اور جن کے تخلیقات اپنے گرد فکر و فن کا ایسا روشن و رنگین ہالہ رکھتی ہیں جنھیں بدلتے ہوئے زمانے کی رو بھی بے نور نہیں کر سکتی۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد زندگی کے خارجی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے انسان کے باطن میں ہلچل پیدا کر دینے والی واردات کی تفسیر کو پیرایۂ اظہار عطا کرنا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے ان تمام جزویات کو ادب میں شامل کیا جو انسانی زندگی میں شب و روز رونما ہوتی ہیں۔

اختر الایمان ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک یا حلقۂ اربابِ ذوق سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی ہر دور سے تعلق رکھا اپنی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں لگے رہے۔ جنھیں اردو شاعری کی تیسری آواز کہا گیا ہے۔ اختر الایمان کی انفرادیت اس میں ہے کہ انھوں نے اشتراکی نقطہ نظر سے دلچسپی رکھنے باوجود اشتراکیت کا سطحی پروپیگنڈہ نہیں کیا۔ اشتراکیت کے تعلق سے اختر الایمان نکھرا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں وہ جذباتی رویہ نہیں جو اشتراکیت کے بارے میں اور جدت پرستی کے شوق میں بعض شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اختر الایمان کی ابتدائی شاعری میں رومانی رنگ نمایاں ہے۔ تاریک سیارہ سے قبل والی نظموں میں یہ کیفیت ایک طرف گہری افسردگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف موہوم اور نیم تاریک تصاویر سے دل بستگی کی شکل میں کچھ عرصہ بعد تک یہی کیفیت قائم رہی۔ اختر الایمان کی اس دور کی شاعری میں بعض باتیں قابل توجہ نظر آتی ہیں۔ اس دور کی شاعری میں بھی وہ اپنی رومانیت کے باوجود اپنی ذات کے خول میں محصور نظر نہیں آتے بلکہ اپنے دور کے مسائل کی پرچھائیاں مختلف زاویوں سے ان کی شخصیت اور فن پر پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ ن۔م۔ راشد اور میراجی کے طرزِ شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود اختر الایمان نے اس نئے طرز کو جنسی گھٹن سے محفوظ رکھا اور عصری زندگی کے مسائل سمو کر اس میں نئی بالیدگی اور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جدید شاعری میں اختر الایمان ایک نئے لہجے کے ساتھ آئے ان کے پہلے مجموعۂ کلام گرداب پر تبصرہ کرتے ہوئے فراق نے لکھا تھا کہ نئے شاعروں میں سب سے گھائل آواز اختر الایمان کی ہے۔ اس میں جو چٹیلا پن تلخی اور جو دہک اور تیز دھار ہے وہ خود بتا دے گی کہ آج ہندوستان کے حساس نوجوانوں کی زندگی کا المیہ کیا ہے۔ اس زمانے کا ایک شعر خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا ؎

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا　　تا کہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

اس آواز پر اختر الایمان نے بڑے ریاض کے بعد قابو پایا ہے۔ ان کی فنی خلوص نے آنی و فانی موضوعات سے بچ کر زندگی کی تہوں میں جانے اور اس کا تجربہ کرنے کی طرف مائل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں تفکر کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب جدید ہیئت کا پابند ہے لیکن خالص آزاد نظم کو انھوں نے برتنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی نظمیں عام طور پر یا تو پابند ہیں یا معریٰ جس میں ہلکی سی تخفیف ملتی ہے۔ لیکن انھوں نے علامات اور اشارات اور پیکر نگاری کے جدید عناصر

کو اپنی شاعری میں داخل کر کے اس جدید ذہن سے قریب کیا ہے۔ ان کا علامتی اسلوب اور موضوعات کی طرف ان کا بالواسطہ رویہ نیز وقتی مسائل کے بجائے بنیادی حقیقتوں کا عرفان حاصل کرنے کی روش نے انھیں خاص طبقے کا شاعر بنا دیا۔

اختر الایمان کی علامتیں داخلی اور حسّی کیفیات کو سمجھاتی ہیں، روحانی کرب، گہری اداسی تنہائی کے احساس وغیرہ کو سمجھنے میں ان کی علامتوں سے مدد ملتی ہے۔ ذہنی تصادم نے جن علامتوں کی تخلیق کی ہے ان میں محبت کی ناکامی اور زندگی کی شکست وریخت کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ مسجد، موت، پرانی فصیل، ایک لڑکا، قلوبطرہ، تنہائی، یادیں وغیرہ اور بھی بہت سی نظمیں علامتی کردار سے پہنچانی جاتی ہیں۔ اختر الایمان نے روایتی پیکروں اور نئے پیکروں کو اپنے گہرے تاثرات سے تابندہ کر دیا ہے۔ جام، گلیاں، خزاں، بہار، رخسار، درد، آنسو، مسافر، چراغ، شبنم، شمع، کلیاں، کانٹے، کارواں، زنجیر وغیرہ اور دوسرے بہت سے الفاظ اور پیکر استعمال کئے ہیں اور اپنے تاثرات سے روایتی لفظوں میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

ایک لڑکا اختر الایمان کی عمدہ تخلیق ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اختر الایمان کی شاعری میں یادوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی شاعری یادوں کی شاعری ہے۔ جب وہ یادوں کے درپن میں دیکھتے ہیں تو انھیں وہ اختر الایمان نظر آیا جو ایک معصوم لڑکا ہے، وہ نہیں کہ جس نے زمانے کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے اس پیکر کو دیکھا ہے جسے وہ ماضی میں چھوڑ آیا تھا، یہ پیکر متحرک ہے زندہ ہے، لڑکے کا یہ پیکر خود شاعر کی شخصیت کا ایک حصّہ ہے جسے وہ اپنے گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ وہ ہمزاد ہے، سایہ ہے، شاعر کے لاشعور کی تاریکیوں سے نکل کر یہ سایہ، یہ ہمزاد مسکراتا ہوا کچھ پوچھ رہا ہے۔ اس نظم کا لڑکا، انسان کے سادہ معصوم اور آزاد پیکر کی علامت بن جاتا ہے اور اس طرح اس نظم کی معنویت پھیل جاتی ہے۔ اس نظم کے متعلق اختر الایمان نے لکھا ہے:

> مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے، اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جا رہا تھا اور میں اس گاؤں کے پاس کھڑا اسی منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے چینی تھی، میں نے کہا کہ گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا، اب سمجھتا ہوں۔

وہ لڑکا شاعر کے لاشعور میں زندہ رہا۔ شاعر دنیا کی کشمکش میں الجھا رہا لیکن وہ لڑکا آزاد تھا، فطرت کی معصومیت اور نیچر کے

حسن میں جذب رہا، تتلیوں کو پکڑتا رہا، کھیتوں، پگڈنڈیوں پر کھیلتا رہا۔ یہ لڑکا اس نظم میں آزادی، فطرت کی معصومیت اور سچائی کا علامیہ بن جاتا ہے، شاعر کی زندگی کی پیچیدگی، کشمکش اور تضاد کا علامیہ اس نظم کا حسن تصادم اور کشمکش میں ہے، شاعر خود کو اپنے معاشرے کی کشمکش اور اپنے عہد کے تضاد میں گرفتار دیکھتا ہے۔ نظم کے پیچھے اس جذباتی کشمکش اور کیفیت کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ اختر الایمان نے ایک لڑکا میں لڑکے کو پوری انسانیت کے ضمیر کا علامیہ بنا دیا ہے۔

نظم 'عمر گریزاں کے نام' میں اختر الایمان نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں زندگی کی مصروفیات اور انسان کی مشینی زندگی کی تصویر کھینچی ہے اس نظم میں محرومی اور ناکامی کا احساس شدید طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنی گزرتی عمر کو وہ محبوب کی صورت دیکھتے ہیں اور تیزی سے گزرتے لمحات اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح کوئی اپنے محبوب سے مخاطب ہوتا ہے۔ نظم کے کچھ مصرعے دیکھئے:

عمر یوں مجھ سے گریزاں ہے کہ ہر گام یہ میں
اس کے دامن سے لپٹا ہوں مناتا ہوں اسے
واسطہ دیتا ہوں محرومی و ناکامی کا
داستاں آبلہ پائی کی سناتا ہوں اُسے
خواب ادھورے ہیں جو دہراتا ہوں ان خوابوں کو
زخم پنہاں ہیں جو وہ زخم دکھاتا ہوں اسے
اس سے کہتا ہوں تمنا کے لب و لہجے میں
اسے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کے حسیں
یوں نہ مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں

عمر گریزاں کو محبوب کی صورت دے کر اختر الایمان نے بہت سے تصورات ابھارے ہیں۔ بیتے ہوئے لمحات کے بعد اُنھیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کو انھوں نے پاس سے دیکھا بھی نہیں۔ اپنے زخموں کو دکھا کر ادھورے خوابوں کا ذکر

munotes.in

کر کے اُسے مناتے ہیں۔اس بات کا احساس کہ وہ کچھ نہ کر سکے اور اس میکانکی زندگی میں اپنی نادانی سے انجام سے غافل رہے اور نقصان برداشت کرتے رہے۔نظم میں گہری افسردگی کی وجہ سے جو تڑپ پیدا ہوئی ہے وہ توجہ طلب بن گئی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اختر الایمان کی شاعری عہدِ جدید کے ادبی سرمایے میں ایک اہم اضافہ ہے۔اسلوب بیان کے انوکھے پن، احساس کی ندوت، شگفتگی، فکر انگیزی، ایمائی انداز اور لفظیات کے نادر ذخیرے کی وجہ سے اختر الایمان کو ہمارے دور کے اچھے شعرا کی صف میں جگہ دی جائے گی۔انہیں وجوہات کی بنا پر آج کے دور میں اختر الایمان کی شاعری نے جدید نسل کو فیض کے بعد شاید سب سے زیادہ متاثر کر رکھا ہے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ اختر الایمان کی شاعری کے علاوہ دیگر ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ اختر الایمان کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

۳۔اختر الایمان کی شاعری میں علامتوں کی کیا اہمیت ہے لکھیے۔

3.7 تجزیہ وتشریحات

(الف) منتخب نظم کا تجزیہ :

ایک لڑکا

اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' ان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ان کی اہم ترین ہی نہیں مقبول ترین نظم بھی ہے۔بالواسطہ طریق اظہار کو اپنا کے شاعر نے ایک لڑکا نظم کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔لفظ لڑکا اور اس کی معصومیت سے واضح ہے اس نظم کا عنوان ضمیر یا ضمیر انسانیت ہے لیکن موضوع پر بحث کرنے سے قبل بہتر یہ ہے کہ اس نظم کے محرک اور اس کے متعلق اختر الایمان کے بیانات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔اختر الایمان اپنے مجموعہ کلام یادیں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

نظم ایک لڑکا پہلی بار میں نے موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی، تصویر کی شکل

میں دیکھی تھی، مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی پر لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی، اس لیے میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات اس وقت نہیں سمجھتا تھا، اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑے تھے ۔کویلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑ میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور ہر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو نہیں روک سکا میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔

یاد کا سا رنگ لیے ہوئے اس نظم کی ابتدا سوانحی فضا میں ہوتی ہے۔ پہلے بند کے ابتدائی حصّے میں ہم نہ صرف نظم کے مرکزی کردار سے متعارف ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے خدوخال کے ساتھ اس کی معصومیت اور فطرت بھی قاری پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس حصّے میں بچپن کی تصویر کشی مناظر سے متعلق تفاصیل اور پیش کش میں شاعر نے ایسی فن کاری دکھائی ہے کہ لڑکا ایک متحرک وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور آم کے باغوں میں کھیتوں کی مینڈوں پر گلیوں اور میلوں میں گھومتا ہوا تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ الغرض دیہاتی پس منظر میں ایک لڑکے کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ لیکن اسی بند کے دوسرے حصّہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکپن کی منزل سے نکال کر جوانی کے خواب ہائے رنگا رنگ نے بھی جگہ بنالی ہے۔ پھر وقت اور معاشرے کے ساتھ تصادم کی شروعات ہوتی ہے اور بیانیہ کا میں راوی یعنی بیان کرنے والے میں سے پہلی بار سوال کرتا ہے کہ تم ہی وہ اختر الایمان ہو؟

دوسرے بند کے نصف اول میں خدائے عزوجل کی نعمتوں کا ذکر نیز اس کے قادر مطلق ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچپن اور جوانی سے وابستہ یادوں کی روشنی میں ہمزاد کے استفسار کے بعد ان حمدیہ اشعار کی کیا ضرورت ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ہمزاد کے پہلی بار استفسار کے وقت شاعر نے خود کو بے بس پایا اور اس بے بسی کو ظاہر کرنے کے لیے فطری طریقہ یہی ہے کہ انسان ذاتِ باری کی عبودیت کا اقرار کرے اس کے سامنے سرِ تسلیمِ خم کرے ذاتِ باری کی نعمتوں کے اعتراف کے بعد آخری پانچ مصرعوں میں شاعر اپنی بے بسی کی شکایت کرتا ہے۔

اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو اور مجھے نکبت
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تو نگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

آخری دو مصرعوں کے علاوہ بقیہ تین مصرعوں میں جہاں اظہار بے بسی، بے بضاعتی اور شکایت کا عنصر موجود ہے، وہیں حیرت کا تاثر بھی شامل ہے۔

شکایت، غم و غصّے، استعجاب، بے چارگی و بے بسی اور طنز کا وہ عنصر جو دوسرے بند میں مدھم تھا تیسرے بند میں تیز تر ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اب مذکور وقت، معاشرہ اور اس کی تازہ ترین صورتِ حال ہے جس کے مطابق آج کا انسان قدم قدم پر حالات سے سمجھوتا کرنے لے لیے مجبور ہے۔ ان چودہ مصرعوں میں اختر الایمان نے ایک فن کار، ایک معصوم اور باضمیر انسان اور ایک تخلیقی ذہن کے کرب اور سماجی تقاضوں کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

مفاہمت اور بے بسی کی وجہ سے چوتھے اور آخری بند کا لب ولہجہ بے حد سخت ہو جاتا ہے۔ اپنے ہمزاد کے مسلسل استفسار پر شاعر یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے!

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا یوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا ایک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں

لیکن بند کے آخری دو مصرعوں میں اچانک اور غیر متوقع گریز نہ صرف صورتِ حال اور نظم کے نتائج کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے بلکہ یہ لڑکا فن کار کی ذات کو مکمل انہدام سے بھی بچا لیتا ہے نیز لڑکے کی مسکراہٹ کے سامنے بالغ کردار بے

بس سا محسوس ہوتا ہے۔لڑکے کا مسکرانا اور آہستہ سے کہنا، دیکھو میں زندہ ہوں، بذاتِ خود گہری معنویت کا حامل ہے اس کا یہ یہ عمل اس کی قوت وتوانائی اور فتح یابی کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس طرح یہ نظم ایک خوش کن ماحول اور مثبت نتائج کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

(ب) منتخب بند کی تشریح :

(ا)

سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کر حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مُرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں

مذکورہ بالا بند اختر الایمان کی نظم 'عمر گریزاں کے نام' سے ماخوذ ہے۔اس نظم میں اختر الایمان نے زندگی کو حسین اور خوب صورت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔محرومی اور ناکامی کا احساس گہرا ہے۔ عمر گریزاں کا پیکر محبوب کا پیکر بن گیا ہے، تیزی سے گذرتے ہوئے لمحوں سے شاعر اسی طرح مخاطب ہے جس طرح وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہوتا ہے۔

زندگی کذارنے کے بعد اختر الایمان کو محسوس ہوتا ہے کہ اسے پاس سے دیکھا بھی نہیں۔زندگی سے محبت اور عقیدت اور والہانہ کیفیت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر کے احساسات کیا ہیں۔زندگی کی میکانیت نے زندگی کے حسن کو محسوس کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔شاعر اپنی محرومی ناکامی اور آبلہ پائی کی داستان سناتا ہے۔اپنے زخموں کو دکھا کر ادھورے خوابوں کا ذکر کرتا ہے اور اُسے مناتا ہے۔

اختر الایمان نے اپنے تجربات سے کچھ پیکر کا انتخاب کیا اور اُن پیکر کو اپنے وژن کی روشنی دی۔عام پیکروں میں اختر نے زندگی کے چکر کو سمجھا دیا اور مصروف زندگی کی تصویر سامنے لاکر رکھ دی۔مذکورہ مصرعوں کا بنیادی خیال یہی ہے کہ میکانکی تگ ودو اور مصروفیتوں کی وجہ سے زندگی اور فطرت کے حسن و جمال کو دیکھا اور محسوس نہیں کیا، لطف حاصل نہیں کیا،

لذت حاصل نہیں کی اور زندگی تیزی سے بھاگتی جارہی ہے، موت کا احساس بھی موجود ہے اور ساتھ ہی زندگی کے حسن کا شدید احساس بھی ہے۔

(۲)

چند لمحوں میں گزرنے کو ہے ہنگامۂ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر
سرد پڑنے لگا اجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردش یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار افسانوں کا اثر ٹوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بہ کمر
سوچ میں ڈوب گئے راہ گزر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں

مذکورہ بالا بند 'نظم' فیصلہ' سے لیا گیا ہے۔ اس نظم میں اختر الایمان نے جذباتی تنہائی کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے، علامتی فکر ملتی ہے، قدروں کا احساس ہوتا ہے۔

اختر الایمان نے اس بند میں لہجے کے دھیمے پن اور داخلی کیفیت کو بڑی فنکارانہ طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ایک فرد کا درد اور سوز معاشرے کے تمام حساس افراد کا سوز اور درد بن جاتا ہے، محبوب کا کردار بھی مبہم نہیں ہے۔ الجھنیں بھی اہم ہیں۔ تنہائی میں سہارے کی تلاش لاشعوری اور نفسیاتی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ پوری فضا شاعر کے جذبات اور احساسات میں جذب ہے، اس کا المیہ رجحان پورے ماحول کو غم ناک بنا دیتا ہے۔ یہ مصرعہ دیکھیے۔

کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں

چند تلخیوں کا بیان ہے جو سچائیوں کو ابھارتی ہیں، داخلی اور اندرونی تباہی کی تصویر بھی ہے اور معاشرہ کی تباہی اور بربادی کا تخیلی خاکہ بھی ہے۔ شاعر کی افسردگی، حقائقِ زندگی کی افسردگی اور اداسی بھی ہے۔ پورا ماحول شاعر کی داخلی کیفیتوں کا آئینہ ہے، تنہائی میں زندگی کو پہچاننے کی کوشش ہے داخلی کیفیتیں ماحول میں بکھر گئی ہیں۔ ہنگامۂ شب، جام صراحی، محفل کا گداز، ساقی کی نظر کا تھکنا، افسانوں کا اثر ٹوٹنا، تلخ حقیقت وغیرہ سب داخلی کیفیتوں کی علامتیں ہیں۔

3.8 خلاصہ

اختر الایمان جمعہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو قلعہ پتھر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں موید الاسلام کے اساتذہ کا بڑا حصّہ رہا، اس کے بعد انھوں نے فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں اختر الایمان نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اینگلو عربک کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد اختر الایمان یہیں سے ایم اے کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی غیر تدریسی سرگرمیوں کے باعث پرنسپل ان سے خوش نہیں تھے اس لیے انھیں وہاں داخلہ نہیں ملا۔ ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد کانفرنس سے اختر الایمان پونہ آئے یہاں اُن کی ملاقات ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد سے ہوئی۔ انھوں نے اختر الایمان کو فلم جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ اختر الایمان نے فوراً ان کی درخواست پر شالیمار اسٹوڈیو جوائن کرلیا اور اس طرح فلموں سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت اختر الایمان شالیمار (پونے) میں تھے۔ حالات جب ناگفتہ بہ ہوگئے اور ترکِ وطن کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈبلیو۔ زیڈ احمد بھی پاکستان چلے گئے اور شالیمار بند ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد اختر الایمان بھی بمبئی چلے آئے اور فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے، منظر نامے اور اسکرین پلے وغیرہ لکھنے شروع کئے اور تاحیات یہیں رہے۔ اختر الایمان کو کئی اعلیٰ اور پروقار ایوارڈ اور اعزازات بھی ملے۔ ۸ر مارچ ۱۹۹۶ء بروز سنیچر کو اختر الایمان کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کرگئی اور ۱۰ر مارچ ۱۹۹۶ء کو باندرہ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

اختر الایمان نے اپنے دوست محمود ایاز کی فرمائش پر اپنی زندگی کے واقعات لکھ کر ان کے پاس بھیجے جو رسالہ سوغات میں قسط وار شائع ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوکر یہ کتاب 'اس آباد خرابے میں' کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ اختر الایمان ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک یا حلقۂ اربابِ ذوق سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی ہر دور سے تعلق رکھا اپنی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں لگے رہے۔ جنھیں اردو شاعری کی تیسری آواز کہا گیا ہے۔ اسلوب بیان کے انوکھے پن، احساس کی ندوت، شگفتگی، فکر انگیزی، ایمائی انداز اور لفظیات کے نادر ذخیرے کی وجہ سے آج کے دور میں اختر الایمان کی شاعری نے جدید نسل کو غالباً فیض کے بعد سب سے زیادہ متاثر کر رکھا ہے۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ اختر الایمان کے عہد کے بارے میں مختصراً لکھیے۔

۲۔ اختر الایمان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جواب لکھئے۔

۱۔ اختر الایمان کا سوانحی خاکہ تحریر کیجیے۔

۲۔ اختر الایمان کی نظم نگاری پر تفصیلی مضمون لکھئے۔

(ج) مندرجہ ذیل بند کی تشریح مع سیاق وسباق کیجیے۔

۱۔ سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کت حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مُرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں

۲۔ چند لمحوں میں گزرنے کو ہے ہنگامۂ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر
سرد پڑنے لگا اجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردش یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار افسانوں کا اثر ٹوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بہ کمر
سوچ میں ڈوب گئے راہ گزر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں

munotes.in

3.10 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
سوانحی	واقعات	دیار	شہر، ملک
محرک	تحریک کرنے والا، ابھارنے والا	سیلانی	سیر کرنے والا
ہمہمہ	شیر کی بھاری آواز	توانگر	امیر
ہجر	جدائی	اندوہ	رنج وغم
وصال	ملاپ	خاشاک	کوڑا کرکٹ
تعطّل	بے کار	ہنرہ کار	لغو، بے ہودہ کام کرنے ولا

موہوم	قیاسی، وہم کیا گیا	کذب	جھوٹ
قنوطیت	زندگی کا تاریک پہلو	ہم زاد	جو ساتھ پیدا ہوا ہو
دریوزہ گر	فقیر، بھکاری	اضطراب آسا	بے چین جیسا

3.11 معاون کتابیں

۱۔ اختر الایمان — اس آباد خرابے میں

۲۔ اختر الایمان — یادیں

۳۔ شاہد ماہلی — اختر الایمان عکس اور جہتیں

۴۔ ڈاکٹر شفیع ایوب — گرداب : ایک مطالعہ

۵۔ آج کل نئی دہلی ۱۹۹۴

☆☆☆

munotes.in

اکائی: 4 ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی

ساخت:

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 خلیل الرحمن اعظمی کا عہد

3.4 خلیل الرحمن اعظمی کی حیات وشخصیت

3.5 خلیل الرحمن اعظمی کی ادبی خدمات

3.6 خلیل الرحمن اعظمی کی نظم نگاری کی خصوصیات

3.7 (الف) منتخب نظم کا تجزیہ

(ب) منتخب بند کی تشریح

3.8 خلاصہ

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.10 فرہنگ

3.11 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد اردو ادب کے عظیم شاعر اور نقاد خلیل الرحمن اعظمی کی حیات، شخصیت اور ادبی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز میں شاعری اور تنقید کو پیش کیا ہے۔ اکائی میں سارے نکات پر روشنی ڈالی جائے گی تا کہ :

طلبا ان کی شاعری کے منفرد انداز سے روشناس ہوسکیں۔

خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید نگاری سے واقف ہوسکیں۔

اردو ادب میں خلیل الرحمن اعظمی کے مقام سے آشنا ہوسکیں۔

munotes.in

3.2 تمہید

خلیل الرحمٰن اعظمی کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ایک اچھے نظم نگار، غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید اور تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی تھے۔ ان کی نگارشات ادب کے آسمان پر تابندہ ستاروں کی مانند چمکتی رہیں گی اور اپنی روشنی سے تحقیق کرنے والوں کو راہ دکھانے کا کام کریں گی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے جنرل سیکریٹری رہے۔ کچھ عرصے تک اس سے وابستہ رہے پھر جدیدیت کا دامن تھام لیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو تنقید کو ایک نئی پہچان دی ہے، شاعری میں بھی کئی طرح کے تجربات کیے۔

3.3 خلیل الرحمٰن اعظمی کا عہد

انسان اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے، وہ ساری چیزیں سماج سے اور اپنے گھر سے سیکھتا ہے۔ خلیل الراحمن اعظمی کے گھر کا ماحول پوری طرح مذہبی تھا مگر خلیل الرحمن زیادہ دن اس ماحول سے سمجھوتا نہیں کر پائے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"میں ایک بہت ہی گھٹے ہوئے مذہبی ماحول میں پیدا ہوا تھا اس لیے سب سے
پہلی میری شعوری بیداری مذہب کے خلاف بغاوت سے شروع ہوتی ہی"۔

خلیل الرحمن کا مزاج شروع سے ہی باغیانہ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مذہبی، سیاسی، سماجی امور کی بندشوں سے آزاد رکھا۔ اُن کی زندگی کا اہم موڑ تب آیا جب وہ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ مزید تعلیم حاصل کرنے پہنچے۔ وہاں اُن کا علمی و ادبی ذوق اور بڑھ گیا۔ علی گڑھ وہ جن لوگوں کی صحبت میں آئے وہ وہاں کی نامور ہستیاں تھیں، ان میں مختار الدین آرزو، فرید بخش قادری، اصغر عباس، اشعر ملیح آبادی، مصور علی، قاضی سلیم، باقر مہدی، محمود ہاشمی، شہاب جعفری، سید یوسف حسن، زیدی صاحب، پروفیسر شمیم حنفی، ریاض الدین قیصر، علی حماد عباسی، ڈاکٹر نسیم قریشی، سید منہاج الدین، علی زاد عباسی، محمد علی، شاہد مہدی، انور معظم، شہریار، خواجہ منصور حسن، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اختر انصاری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، پروفیسر اسلوب انصاری، ڈاکٹر وحید اختر، سلامت اللہ خان پروفیسر خورشید الاسلام اور معین احسن جذبی وغیرہ جیسے لوگوں سے اُن کے قریبی مراسم رہے۔ اور اسی وجہ سے علی گڑھ کی آب و ہوا اُنھیں راس آئی، اسی ماحول میں اُنھوں نے کامیاب نظمیں، تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو ادب میں خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کی خلاقانہ تحریریں اس دور میں کافی مقبول ہو رہی تھیں۔ قاضی سلیم جدیدیت کے نمایاں شاعر تھے، انھوں نے متعدد

موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اور اپنی معاصر اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔تو دوسری طرف اصغر عباس تنقید و تحقیق کے میدان میں اپنا جلوہ بکھیر رہیں تھے۔ان کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی بیک وقت ناقد، دانشور، ادیب اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ پہلی جنگ آزادی کے ہندوستان پر کیا اثرات رونما ہوئے؟

۲۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کیا کوشش کی؟

۳۔ اردو غزل نے کون سی ارتقائی منزلیں طے کی؟ تحریر کیجئے۔

3.4 خلیل الرحمٰن اعظمی کی حیات و شخصیت

اعظم گڑھ یوپی کے سیدھا سلطان پور کے رہنے والے عالم دین مولانا محمد شفیع کے گھر 9 اگست 1927 کو خلیل الرحمن کی پیدائش ہوئی یہی خلیل الرحمن ہمارے نصاب میں شامل شاعر خلیل الرحمن اعظمی ہیں جو اپنے گاؤں کی مناسبت سے اپنے نام کے ساتھ 'مستقیمی' استعمال کرتے تھے یعنی سیدھا اور آخر میں 'اعظمی' اختیار کر لیا تھا۔ان کے والد محمد شفیع اپنے عہد میں عالم دین تھے۔اپنے معاشرے کی فلاح و بہبودی کے لیے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔جس کے نتیجہ میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد پڑی۔محمد شفیع کا تعلق ہمیشہ سے عالم اور فاضل ادیبوں کے ساتھ ہی رہا۔ان کی بیگم کا نام رابعہ بیگم تھا۔رابعہ بیگم کی دلچسپی ہمیشہ کتابوں میں رہی ہے۔مطالعہ کرنا ان کا ذوق تھا ان کے چار بیٹے تھے جن میں خلیل الرحمن اعظمی سب سے چھوٹے تھے۔گھر کا ماحول علمی و ادبی ہونے کی وجہ سے خلیل الرحمٰن پر بھی اس کا اثر ہوا۔انہوں نے کم عمری میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا۔سیدھا سلطان پور کے قریب کے گاؤں بنیا پارہ کے اسکول میں جماعت چہارم تک انہوں نے تعلیم حاصل کی۔وہ بچپن سے ہی ذہین تھے۔شعر و شاعری کا ذوق و شوق کم عمری ہی سے ذہین پر طاری ہو گیا تھا۔انٹرمیڈیٹ کا امتحان انہوں نے 1930ء میں علی گڑھ سے کامیاب کیا۔اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1951 میں ایم اے پاس کیا۔اس کے بعد 1957 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے مقالے کا عنوان 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' تھا۔اسی سال ان کی شادی راشدہ خلیل سے طے ہوئی۔بقول راشدہ خلیل :

''بحیثیت ایک اچھے انسان اور بہترین شوہر، ان کے اندر اتنی خوبیاں تھیں کہ ان

کا بیان کرنا دشوار ہے ۔ بہت کم لوگ اپنے گھریلو زندگی میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں ۔خلیل الرحمن کو بچپن سے ہی کھیل کود کا شوق نہیں تھا۔ وہ ہر گھڑی کسی خیال میں کھوئے رہتے ،خود میں مگن رہتے ، گنگناتے رہتے۔ ان کی دلچسپی کا ذریعہ صرف کتابیں تھیں۔''

خلیل الرحمن اعظمی کے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے،جس کا اثر ان کی تعلیم پر ہوا۔اس وقت ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ ملازمت کرتے ہوئے تعلیم حاصل کریں ۔اس غرض سے وہ دہلی روانہ ہوئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملازمت کرنے لگے۔وہ ایک اچھے معلم تھے تدریس میں مہارت رکھتے تھے۔بقول ڈاکٹر انصار اللہ:

"ان لکچروں کے دوران مجھے خلیل صاحب سے قریب تر آنے اور ان کی وسعت نظر اور مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کی تدریس کی دل نشینی کا اندازہ کرنے کا موقع ملا تھا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کامیاب استاد تھے۔انہوں نے عمر زیادہ نہیں پائی، اس کے باوجود شاگردوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے جو علم و ادب کی خدمت میں برابر مصروف ہے"

انھوں نے کبھی طلباء کو ڈانٹا نہیں تھا۔ پیار و شفقت سے ان کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کیا۔موضوع چاہے کوئی بھی ہو، انھیں شاعری یا نثر، تحقیق ہو یا تنقید ہر چیز پر عبور حاصل تھا۔ان کے لیکچر کی یہ خصوصیت تھی کہ پوری کلاس میں خاموشی رہتی اور طلباء بڑی دلچسپی اور سے سماعت فرماتے تھے۔اتنا موثر اور دل نشین انداز بیان تھا۔انہیں پروفیسر شپ کا پرموشن نہیں دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے، پھر بھی اس چیز کو انہوں نے اپنے تدریسی پیشے میں کبھی آڑے نہیں آنے دیا۔ 1956ء میں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ان کا تقرر ہوا۔اپنی وفات سے کچھ دن قبل تین تین گھنٹے پڑھایا کرتے تھے۔ وہ علم کا ایک ایسا چشمہ تھے جو طالب علم کی طلب کو پورا کرتا۔ ہر طالب علم ان پر جان نچھاور کرتا اس کے باوجود خلیل صاحب نے کبھی اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔

اپنے علم کا رعب وہ کبھی اپنے طلبہ پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔جو طلبا راستہ بھٹک گئے، ان سے رابطہ کر کے انھیں دوبارہ علم کی راہ پر گامزن کرتے ۔خلیل الرحمن طلباء کو روایتی انداز میں درس دینے کے مخالف تھے۔وہ بچوں میں آزادانہ طور پر غور و فکر پیدا کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔کبھی کبھی کسی فلم، مشاعرہ وغیرہ پر تبصرہ لکھنے کو کہتے۔ان کی جماعت میں طلباء کی تعداد دیگر اساتذہ کے مقابلے زیادہ ہوتی تھی۔انہوں نے ہمیشہ طلباء کی تحریر درست کرنے پر غور کیا۔وہ قدیم کتابوں سے لے کر دورِ حاضر کی کتابوں اور رسالوں کی مثالیں دیتے۔

1976ء میں بلڈ کینسر نے خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی ادبی، سیاسی، سماجی زندگی کی رفتار کو روک دیا۔ آب و ہوا بدلنے کی غرض سے کشمیر گئے۔ وہاں بھی کچھ ماہ بعد پھر سے تر و تازہ ہو کر ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آل انڈیا ریڈیو پر پروگرام دیے، کئی سیمینار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریری کام مسلسل جاری رہا۔ پھر طلباء کے امتحانات لیے اُن کے مسئلوں کو حل کیا۔

یکم جون 1978ء کو وہ دن آ ہی گیا جس نے اردو ادب کے اس روشن مینار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیا جس نے اردو ادب کو جاتے جاتے بے شُمار ادبی دولت سے مالا مال کر دیا۔

خلیل الرحمن اعظمی صاحب ایک زندہ دل، خوش مزاج شخص تھے۔ بقول قاضی عبدالرحمن ہاشمی :

''خلیل صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوستوں کی انجمن میں جانِ انجمن بن جاتے،
خود تو خوش مزاج تھے ہی، جو اُن کے ساتھ رہتا وہ بھی سدا مُسکُراتا۔''

وہ بہت سی صفات کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب استاد تھے۔ ان میں اپنے پیشے کو لے کر سنجیدگی اور شایستگی تھی۔ اپنے مضمون کا گہرا مطالعہ کرتے۔ انھیں زبان پر عبور حاصل تھا اور انداز بیان بھی کمال تھا۔ طلبا بھی انہیں اتنی ہی دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ ان کے اس علم اور یاداشت کے بارے میں خلیق انجم رقم طراز ہیں :

"میں زندگی میں صرف دو آدمیوں کے مطالعہ اور یادداشت سے متاثر ہوا ہوں
بلکہ مرعوب ہوا ہوں ایک تو قاضی عبدالودود دوسرے خلیل الرحمٰن اعظمی۔ فارسی اور
اردو کے کلاسیکی ادب کا جو گہرا مطالعہ قاضی صاحب کا ہے شاید ہی کسی اور کا ہو۔
اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر خلیل صاحب کا یہی حال تھا۔''

مطالعہ کی جانچ

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کہ والد صاحب کا کیا پیشہ تھا؟

۳۔ راشدہ خلیل کس کا نام تھا؟

۴۔ خلیل الرحمٰن کب پیدا ہوئے؟

۵۔ خلیل الرحمٰن نے کہاں ملازمت انجام دی؟

munotes.in

3.5 خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی خدمات

بیسویں صدی کے اہم نقادوں میں خلیل صاحب کا شمار ہوتا ہے۔ایک دستاویز کی حیثیت سے ان کی نظری تنقید اور عملی تنقید کو دیکھا جا سکتا ہے۔ان کے تنقیدی مجموعہ میں فکر وفن 1956ء ،زاویہ نگاہ 1965ء اور مضامین نو 1977ء قابل ذکر ہیں۔''فکر وفن'' ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے جس میں درج ذیل مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۔غالب اور عصر جدید

۲۔بہادر شاہ ظفر [ایک نئے زاویئے سے]

۳۔خواجہ میر درد [عشقیہ شاعری کے آینہ میں]

۴۔حسرت کے شاعرانہ مرتبے کا تعین

۵۔داغ کا فن

طرز مومن

۷۔جوش ملیح آبادی

۸۔جمیل مظہری

۹۔مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور

۱۰۔جذبی

اس کے علاوہ اردو میں 'ترقی پسند ادبی تحریک' ان کا تحقیقی مقالہ تھا جو 1927ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ 'ماہنامہ بیداری' میں ان کی درج ذیل نثری تحریریں شائع ہوئیں ہیں۔

1۔شذرات

2۔دیہاتی شاعری (مضمون)

3۔تعلیم کی ضرورت (مضمون)

4۔دل چسپ خط وکتابت (افسانہ)

5۔اپنی باتیں

6۔صحت کی تلاش (خصّہ)

7- دیوی [افسانہ]

8-چمپا

munotes.in

خلیل الرحمن کے درج ذیل تنقیدی مضامین 'مقدمہ کلام آتش' کے نام سے 1959ء میں شائع ہوئے ہیں۔

ا۔آتش کی شخصیت

2۔آتش کے بنیادی تصورات

3۔آتش کے کلام کا نفسیاتی پاس منظر

4۔آتش کا فن

5۔آتش کا تصوف

اُن کا پہلا شعری مجموعہ کاغذی پیرہن 1956ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کلام میں غزلوں کی کل تعداد 28 اور نظموں کی تعداد 30 ہے۔1965ء میں اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'نیا عہد نامہ' شائع ہوا جس میں غزلوں کی تعداد 37 ہے۔اُن کا آخری شعری مجموعہ 'زندگی اے زندگی' ہے۔جو 1983ء میں شائع ہوا۔اس شعری مجموعے میں 40 غزلیں ہیں جن کی تعداد پچھلے دو مجموعوں میں شامل غزلوں سے زیادہ ہے۔ان غزلوں کے مطالعے سے اُن کی تحریر کی پختگی اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے۔اس مجموعے میں بھی اُن کے ذاتی تجربوں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔افسانہ 'دیوی' کس رسالہ میں شایع ہوا؟

۲۔خلیل الرحمن اعظمی کے تحقیقی مقالے کا عنوان کیا تھا؟

۳۔''ترقی پسند ادبی تحریک'' کو کب کتابی شکل ملی؟

۴۔مجموعہ ''فکر و فن'' کا سنِ اشاعت کیا ہے؟

۵۔خلیل الرحمن کا پہلا تنقیدی مجموعہ کون سا ہے؟

mungres.in

3.6 خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم نگاری کی خصوصیات

خلیل الرحمٰن اعظمی نے شاعری کا آغاز نظم نگاری سے کیا۔انھوں نے میر کی شاعری کی گہرائی سے سمجھ لیا تھا۔ نیا عہدنامہ کے دیباچہ میں وہ بیان کرتے ہے :

"میر کی آواز کو اپنی آواز سمجھنا میرے لیے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہ تھا بلکہ یہ میرے پوری زندگی کا مسئلہ تھا اس آواز کا سراغ مجھے نہ ملتا تو میری روح کا غم جو مجھے اندر سے کھائے جا رہا تھا، نہ جانے مجھے کن اندھی وادیوں میں لے جاتا۔''

اعظمی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ''کاغذی پیرہن'' ہے جو 1957ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے میں نظموں کو پہلے حصے نقش اول اور غزلوں کو بعد کے حصے نئی فصل میں رکھا گیا ہے۔ پہلے حصہ کی پہلی نظم "میرا گھر، میرا ویرانہ ہے۔اسمجموعے کی زیادہ تر نظموں میں اُن کی زندگی کے کچھ پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔

نظم "یاد" میں خلیل صاحب نے وطن سے بچھڑنے کا درد اور اکیلے پن کو حقیقی اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔تنہائی کا ناگ انھیں پل پل ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی اسی کرب زدہ تنہائی کی عکاسی اُنھوں نے اس نظم میں کی ہے۔ اپنی ماں سے، دوست احباب سے اور وطن کی مٹّی سے محرومیت انھیں بے چین کر رہی ہے۔ یہ غم اور تنہائی ان کا مسلسل پیچھا کرتی ہے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔۔۔۔

ابھی بھی دروازہ روز کھلتا ہے
راستہ میرا تک رہا ہے کوئی
میرے گھر کے اُداس منظر پر
میرے ماں کے سفید آنچل کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں روتی ہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری میں نئے امکانات کی جھلک کثرت سے پائی جاتی ہے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود اس تحریک کو اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ان کی شاعری میں داخلی احساس کو اُنھوں میں ترجیح دی ہے جن میں صداقت وسوز و گداز پایا جاتا ہے۔نظیر صدیقی نے بھی ان کی نظموں کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے:

''ان نظموں کے سرسری مطالعے میں بھی جو بات سب سے پہلے محسوس ہوتی ہے وہ

یہ ہے کہ یہ نظمیں شاعر کی سوانح عمری کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ان ٹکڑوں میں نہ تسلسل ہے نہ تفصیل، پھر بھی وہ شاعر کے حالات سے لے کر اس کی نفسیات تک غمازی کرتے نظر آتے ہیں۔خلیل کی نظموں میں یہ تو کہیں بھی نہ ملے گا کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے لیکن ان میں ان حالات اور اس ماحول کی مصوری ضرور ملتی ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہے۔''

اُن کی نظموں میں کئی ایسی نظمیں ہیں جو پوری طرح سوانحی عناصر اور ذاتی تجربات کو پیش تو نہیں کرتیں پر ان میں کچھ ایسے عناصر ضرور مل جاتے ہیں جو ان کی ذات اور شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔اس ضمن میں اُن کی نظم "نیا جنم، بہار کی واپسی اور کہانیاں وغیرہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔اعظمی صاحب نے ان نظموں میں تشبیہات و استعارات کو مخصوص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ان کی نظموں میں رومانیت کی فضا ہے۔

تین بندوں پر مشتمل نظم 'جن راتوں میں نیند نہ آئے' جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔نظم چھوٹی بحر میں ہے مگر معنی کے اعتبار سے پڑھنے والے پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔عشقیہ انداز میں لکھی گئی اس نظم میں بھی ان کے درد و کرب کو قریب سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس نظم میں بچھڑنے کا غم اور محرومیت کا عنصر غالب ہے۔اپنے قریبی شخص کے بچھڑنے پر دل کی کیفیت کس طرح دشوار ہو جاتی ہے، اسے خلیل الرحمٰن نے نمایاں انداز میں بیان کیا ہے۔ذہن پر طاری اس احساسِ ناکامی سے وہ اوب گئے ہیں جس سے ابھرنے کے سبھی راستے بند ہو چکے ہیں۔وہ اس درد میں ساری رات جاگتے رہتے ہیں اور نیند ہے کہ پلکوں سے اوجھل! اُن کی نظموں کے سوانحی، جدائی، تشنگی عشق، محرومیت جیسے موضوعات کو سنجیدگی کا جامہ پہنایا گیا ہے۔جس میں ایک ذہنی تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک نظم' اپنے بچے کے نام' ہے جو انھوں نے اپنے فرزند کے لیے لکھی ہے۔اس نظم میں با لکل آسان اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔اس نظم میں انھوں نے اپنے بچے کی پیدائش پر اپنی خوشی اور شفقت کا اظہار کرتے ہوئے دعائیں دی ہیں کہ جن دکھوں اور محرومیوں میں والد کی زندگی گزری ہے اس کا ایک فیصد حصہ بھی اپنے فرزند کے حصے میں نہ آئے۔خلیل الرحمٰن جس عہد میں لکھ رہے تھے وہ دور ترقی پسندی اور جدیدیت کا دور تھا۔اسی وقت میں لکھی گئی اُن کی ایک نظم 'میں گوتم نہیں ہوں' میں اُنھوں نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے جب گوتم بدھ گیان حاصل کرنے کی غرض سے اپنا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نکل پڑے اور پیپل کے پیڑ کے نیچے دھیان میں بیٹھ گئے، تب اُنھیں کچھ عرصے کی سمادھی کے بعد یہ علم یا گیان حاصل ہوا کہ سنسار میں دُکھ ہے اور دکھوں سے نجات بھی پائی جا سکتی ہے مگر خلیل صاحب اس نظم

میں یہ کہتے ہیں کہ اُن کی تکلیف سے نجات پانا اتنا آسان مرحلہ نہیں ہے۔اُن کا درد اتنی آسانی سے کم نہیں ہوگا۔

اعظمی صاحب کی تینوں مجموعوں کی بات کی جائیں جس میں کاغذی پیرہن، زِندگی اے زِندگی، نیا عہد نامہ ' کی بات کریں تو ہم اس نقطہ نظر پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُن کی شاعری میں رومانیت کا احساس بھی پایا گیا ہے۔اُن کی نظموں اور اُن کی زندگی کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔اُن کی نظمیں اُن کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔خلیل الرحمن اعظمی کی وفات کب ہوئی ؟

۲۔'' کاغذی پیرہن''میں کل کتنی غزلیں ہیں؟

۳۔''زندگی اے زندگی''شعری مجموعہ کب شایع ہو؟

۴۔خلیل الرحمن اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہیں؟

۵۔خلیل الرحمن اعظمی کس شاعر سے زیادہ متاثر تھے؟

۶۔۔خلیل الرحمن اعظمی کس تحریک سے وابستہ تھے؟

3.6 3.6.1 تجزیہ وتشریحات

(الف) منتخب نظم کا تجزیہ :

یاد

نظم ''یاد'' خلیل الرحمن اعظمی کے شعری مجموعہ'' کاغذی پیرہن'' سے ماخوذ ہے۔جس کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا حصہ ہے 'نقش اول' اور دوسرا 'نئی فصل'۔اس نظم میں شاعر نے بتایا ہے کہ انسان اپنی ماں ،دوست احباب اور وطن سے دور جاتا ہے تو وہ کس طرح بے چین ہوتا ہے۔یہ غم اور تنہائی ان کا پیچھا مسلسل کرتے ہیں۔دکھ ور محرومی کے گھنے بادلوں کے بیچ وہ اُمید کی شعاؤں کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

اس نظم کی قرات بتاتی ہے کہ درد و کرب اور تنہائی نے شاعر کو ہر سمت سے گھیرا ہوا ہے۔شاعر پرانے زخم کو کریدرہا ہے جس کی وجہ سے وہ غم میں مبتلا ہو گیا ہے۔شاعر کو ایک ہی چیز کا درد ہے اور وہ ہے اپنوں کی جدائی۔اُن سے بچھڑ کر وہ

اس قدر بے چین ہے جیسے جل بن مچھلی۔ وطن سے بچھڑنے کا درد اور اکیلے پن کو حقیقی اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تنہائی کا ناگ پل پل ڈسنے دوڑتا ہے۔ شاعر نے اپنے دل و ذہن میں چل رہی یادوں کی اس جنگ کو قلم بند کیا ہے۔ شاعر کو اُمید بھی ہے کہ اسے بھی سب لوگ ایسے ہی یاد کر رہے ہوں گے جیسے وہ سب کو یاد کرتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس نظم میں سوز و گداز ہے۔ سلیس زبان کے استعمال کے ساتھ انھوں نے اپنی دلی و ذہنی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ اگر چہ یہ نظم ان کے اپنے کرب کی داستان بیان کرتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم 'یاد' ہر اس انسان کی دلی و ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے جو اپنوں سے جدا ہے۔

(ب) تشریح :

میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں کے موضوعات میں کرب، غم، محرومیت دکھائی دیتے ہیں۔ درج بالا بند اُن کی ایک نظم "میں گوتم نہیں ہوں" سے ماخوذ ہیں۔

اس نظم میں شاعر نے سدھارتھ (گوتم بدھ) کے راج پاٹ چھوڑ کر اپنے وجود کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر جنگل جنگل بھٹکنے اور نروان یا نجات حاصل کرنے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عام آدمی کے بھٹکتے رہنے کی تصویر کشی کی ہے۔ گوتم بدھ نے اپنے وجود کا گیان تو حاصل کر لیا لیکن آج کوئی بھی انسان خود کو سمجھنے اور پانے کی کوشش میں اگر بھٹکنا شروع کرے تو اسے گیان تو حاصل نہیں ہوتا، وہ اپنے وجود کو نہیں پاتا بلکہ وہ کہیں اور بھٹک جاتا ہے۔ یہی کیفیت شاعر کی بھی ہے۔ شاعر نے بھی خود کو پانے کے لیے گھر بار چھوڑ دیا لیکن گوتم بدھ کی طرح وہ خود کو نہیں پا سکے۔

inunotes.in

3.7 خلاصہ

خلیل الرحمن اعظمی ناخد، شاعر، افسانہ نگار الگ الگ رول ایک وقت میں نبھاے، وہ جس تحریک ن سے جڈے اس نے ادب کو آسمان سے نک زمین پر لایا تھا اس تحریک کے وہ ترقی پسند تحریک کے جنرل سیکریٹری بنے کچھ عرصے تک اس سے وابستہ رہے پھر جدیدیت کا دامن تھام لیا۔ خلیل الرحمٰن نے اردو تنقید کو ایک نئی پہچان دی ہے شاعری میں بھی کئی طرح کے تجربات کیے ہیں ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ کے دور میں ہوا اس آدمی کی ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں کی تحریکات زور وشور سے چل رہی تھی آزادی کی تحریک تقسیم ہند، ترقی پسند تحریک، جدیدیت ہر تحریک کو انہوں نے قریب سے مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے اہم نقادوں میں خلیل صاحب کا شمار ہوتا ہے ایک دستاویز کی حیثیت سے ان کی نظری تنقید اور عملی تنقید کو دیکھا جا سکتا ہے ان کے تنقیدی مجموعہ میں فکر وفن 1956 ، زاویہ نگاہ 1965 اور مضامین نو 1977 قابل ذکر ہے۔

اُن کا پہلا شعری مجموعہ کاغذی پیرہن ہے۔ خلیل صاحب ایک آزاد خیال رکھتے اُن کے موضوعات بھی نمایاں قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے فعال رکن تھے مگر اس کی جمودیت کے سبب وہ اُس سے درکنار ہو گئے۔ اعظمی صاحب کی تینوں مجموعوں کی بات کی جائیں جس میں کاغذی پیرہن، زِندگی اے زِندگی، نیا عہد نامہ ' کی بات کریں تو ہم اس نقطہ نظر پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُن کی شاعری میں رومانیت کا احساس پایا گیا ہے۔ اُن کی نظمیں اور اُن کی زندگی کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اُن کی زندگی کی ترجمانی اُن کی نظمیں کرتی ہے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ خلیل الرحمن اعظمی کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ خلیل الرحمن اعظمی کی غزلوں کے موضوعات کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

۳۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شخصیت بیان کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۲۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ خلیل الرحمن اعظمی کی ادبی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

munotes.in

۴۔ خلیل الرحمن اعظمی کی نظم ''بن باس'' کا تجزیہ کیجیے۔

۵۔ خلیل الرحمن اعظمی کی نظم ''جن راتوں میں نیند نہ آئے'' کا جایزہ لیجیے۔

(ج) سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل بند کی تشریح کیجیے۔

۱۔ وہ خاموش رہا
وہ دیکھ رہا تھا اس میلے سے طاق کو
جس پر
اب بھی ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی

۲۔ مجھ کو اجداد سے وراثت سے
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال وخاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا

3.9 فرہنگ

ہشاش بشاش	نہایت خوش وخرم
دشت	صحرا جنگل
غرب	چھپنا
معدوم	نیست نابود
مصوری	تصویر کشی

munotes.in

3.10 معاون کتابیں

۱۔	خلیل الرحمٰن اعظمی حیات اور ادبی خدمات	وجہ القمر صدیقی
۲۔	خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری	عفت آرا شمسی
۳۔	خلیل الرحمٰن اعظمی ایک باز یافت	یڈیٹر: آصف اعظمی
۴۔	اردو تنقید کے معمار	ایڈیٹر ایم حبیب خان
۵۔	اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
۶۔	فکر و فن	خلیل الرحمٰن اعظمی
۷۔	زندگی اے زندگی	خلیل الرحمٰن اعظمی
۸۔	مضامین نو	خلیل الرحمٰن اعظمی
۹۔	کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی
۱۰۔	انتخاب کلام خلیل الرحمن اعظمی	تبصرے۔خلیل الرحمن اعظمی
۱۱۔	ہندوستانی ادب کے معمار	مہتاب حیدر نقوی
۱۲۔	خلیل الرحمن اعظمی ترقی پسندی سے جدیدیت تک	سلام عشرت
۱۳۔	اعلی گڑھ میگزین:۔شمارہ1952،000	
۱۴۔	نئی نظم کا سفر ۱۹۳۶ کے بعد:۔مرتب	خلیل الرحمٰن اعظمی
۱۵۔	نیا عہد نامہ	خلیل الرحمٰن اعظمی

☆☆☆

munotes.in

نصاب

(حصہ دوم)

(۱) اختر الایمان

۱۔ مناجات

۲۔ متاعِ رائیگاں

۳۔ ایک لڑکا

۴۔ فیصلہ

۵۔ آگہی

۶۔ احتساب

۷۔ دعا

۸۔ کرم کتابی

۹ ۔ عمر گریزاں کے نام

۱۰۔ حرف تمنا

munotes.in

(۲) خلیل الرحمٰن اعظمی

۱۔ یاد

۲۔ بہار کی واپسی

۳۔ بن باس

۴۔ اپنے بچے کے نام

۵۔ سوداگر

۶۔ میں گوتم نہیں ہوں

۷۔ لمحے کی موت

۸۔ خوابوں سے ڈر لگتا ہے

۹۔ میں اور میں

۱۰۔ راتوں میں نیند نہ آئے

munotes.in

مُناجات

آشفتہ خاطری مری مٹّی میں ہے ملی
تم یونہی مجھ کو دیکھ کے آزردہ ہوگئے
ہر لمحہ قبر ہے گئے لمحے کی، ہر نفس
پہلے نفس کی گور ہے، افسردہ ہوگئے
کارِ جہاں ڈھکا ہے مناظر کے حُسن سے
افسونِ جدلیات سے غم مُردہ ہوگئے
یوں سمجھو ساز باز ہے اک موت سے حیات
شر قوتِ نما کا محرّک ہے، سادگی
اک ماندگی کی شکل ہے، یونہی چلے چلیں
بے پایاں ممکنات کا یہ بحرِ بے کنار
ہم جس میں تیرتے ہیں ، خدائے عظیم ہے
مظہر ہے یا خُدا کا، چلو سر بہ سجدہ ہوں

اے ربّ لایزال کوئی راہِ مستقیم
مجھ کو نہ بخش دینا، یونہی بے قرار رکھ
لاکے محیط میرا مرض آگہی نہیں
اک تشنگی ہے، میرا مرض لا علاج کر
پھیلا دے اور آگ زمیں پر مرے لیے
جو دہر کا مزاج ہے میرا مزاج کر

munotes.in

منعم ، غنیم ، قافلہ سالار ، اشتہاء
کچھ اس طرح کے اور بھی الفاظ دے مجھے
مفلوج کرکے میرے قویٰ، میرے ولولے
پھر حوصلہ دے، ہمتِ پرواز دے مجھے
آبِ حیات زہر بنادے مرے لیے
یہ زہر اس کے بعد رگوں میں اُتار دے
دن، اس کی برکتیں ، جسے جی چاہے بخش دے
دائم تڑپ مجھے ، خلش ِانتظار دے

۱۵/مارچ، ۱۹۷۳

☆☆☆

munotes.in

متاعِ رائگاں

یہ دردِ زندگی کس کی امانت ہے کسے دے دوں
کوئی وارث نہیں اس کا، متاعِ رائگاں ہے یہ
مسیحا اب نہ آئیں گے، یہی نشترگِ جاں میں
خلش بنتا رہے گا، میری سانسوں میں نہاں ہے یہ
خُدا یا ہم سے پہلے لوگ بھی جو اس زمیں پر تھے
یونہی پامال ہوتے تھے، جو اس کے بعد آئیں گے
امیدِ صبح کے خنجر سے زخمی ہو کے جائیں گے؟
(کہاں جاکر رکے گا قافلہ ان سو گواروں کا)
یہ پھر بھی تیرے بندے ہیں،تری ہی حمد گائیں گے
انھیں آنکھیں تو دے دی ہیں، بصارت بھی اِنھیں دے دے
تجھے سب ڈھونڈھتے ہیں اس طرح اندھے ہیں سب جیسے
اسی کورے ورق پر کچھ عبارت بھی انھیں دے دے
کھڑا ہے منہ کیےمشرق کی جانب ، کوئی مغرب کی
(مری تصویر میں ان چیختے رنگوں کی ایسی کیا ضرورت تھی)
خُدا یا بخش دے اُن بے گناہوں کے گناہوں کو
یہ معنی ڈھونڈتے ہیں ، کشمکش میں رات اور دن کی
حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں سال اور سِن کی
یہ سب مجبور ہیں ، اِن پر درِ توبہ کھُلا رکھنا
یہ دنیا خوف اور لالچ پہ جس کی نیو رکھی ہے
اِسی مٹی سے پھوٹے ہیں ، اسی دھرتی کے پالے ہیں

munotes.in

اُجالا بھی یہی ہیں اِ س زمیں کا اور اندھیرا بھی
یہی شہ کار ہیں تیرا، یہی پاؤں کے چھالے ہیں
(یہ سب کے سب لباسِ فاخرہ میں میلی بھیڑیں ہیں)
الہٰ العالمیں اِن کی خطا سے دَر گزر کرنا
بہت معذور ہیں یہ خود نگر اپنی جبلّت سے
مقدّر اِن کا ہے شام و سحر کو روز سَر کرنا
مساعی ان کی سیم و زر کے ڈھیروں میں بدل دینا
ترے پاس آئیں ، موتی کے محل محنت کا پھل دینا

۲۵/جون، ۱۹۷۴ء

☆☆☆

munotes.in

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی منڈیوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں ، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سِنوں کی رنگ رلیوں میں
سحردم ، جھٹپٹے کے وقت ، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، اُن کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گُم ، تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں ، جلتی ریت ، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سِن حسینوں میں بہت خوش کام و دلِ رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں ، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخو ں میں چھپ کر جھولتا ، مُڑتا
مجھے اک لڑکا ، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا ، جیسے تُند چشموں کا، رواں پا نی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے ، ہر گام پر ، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں ، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

munotes.in

خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اُس نے زمیں کو ایسے پھیلا یا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اُسی کی بخششیں ہیں ، اُس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا، اک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کُن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے!
اسی نے خسروی دی ہے، لئیموں کو، مجھے نکہت
اُسی نے باوہ گویو ں کو مرا خازن بنایاہے
تو نگر ہر زہ کاروں کو ،کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جز اک ذہن رسا کچھ بھی نہیں ، پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اُٹھانا ہے
عناصر منتشر ہوجانے ، نبض ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب ،کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکّے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تُو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح ، لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

nunotes.in

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلاّ کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم
ا سے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مرچکا ،جس نے
کبھی چاہا تھا اک کاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے ،جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں !

دسمبر ۱۹۵۴ء

☆☆☆

munotes.in

فیصلہ

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں!

اپنے شوریدہ ارادے کو اپاہج کر لوں
اپنی مجروح تمنا کا مداوا نہ کروں
اپنی خوابیدہ محبت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصوّر کے سہارے کے لیے
ایک بھی شمع سرِ راہ جلایا نہ کروں

اپنے بے سود تخیّل کو بکھر جانے دوں
زندگی جیسے گزرتی ہے گزر جانے دوں!

چند لمحوں میں گزرنے کو ہے ہنگامۂ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر
سرد پڑنے لگا اجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردشِ یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار فسانوں کا اثر ٹوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بہ کمر

سوچ میں ڈوب گئے راہ گزر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں؟

munotes.in

میں ابھی آخری مے نوش ہوں مے خانے میں
دیکھتا کیا ہے مری سمت، بڑھا، جام بڑھا
لا صراحی کو مرے پاس شکستہ ہی سہی
چھیڑ ٹوٹے ہوئے تاروں کو کراہیں تو ذرا
سوچتا کیا ہے اُنڈیل، اور اُنڈیل، اور اُنڈیل
سرد پڑتی ہوئی محفل کے تکدر پہ نہ جا

اپنے بیدار تفکّر کی ہلاکت پہ ہنسوں
آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں!

☆☆☆

munotes.in

آ گہی

میں جب طفلِ مکتب تھا، ہر بات ، ہر فلسفہ جانتا تھا
کھڑے ہو کے منبر پہ پہروں سلاطینِ پارین و حاضر
حکایاتِ شیرین و تلخ اُن کی، اُن کے درخشاں جرائم
جو صفحاتِ تاریخ پر کارنامے ہیں ، ان کے اوامر
نواہی ،حکیموں کے اقوال ، دانا خطیبوں کے خطبے
جنھیں مستمندوں نے باقی رکھا ، اُس کا مخفی وظاہر
فنونِ لطیفہ ، خداوند کے حکم نامے، فرامین
جنھیں مسخ کرتے رہے پیرزادے، جہاں کے عناصر
ہر اک سخت موضوع پر اِس طرح بولتا تھا کہ مجھ کو
سمندر سمجھتے تھے سب علم وفن کا، ہر اک میری خاطر
تگ و دَو میں رہتا تھا، لیکن یکا یک ہوا کیا یہ مجھ کو
یہ محسوس ہوتا ہے سوتے سے اٹّھا ہوں، ملنے سے قاصر
کسی بحر کے سُونے ساحل پر بیٹھا ہوں گردن جھکائے
سرِ شام آئی ہے دیکھو تو ہے آ گہی کتنی شاطر!

فروری ۱۹۵۸ء

☆☆☆

احتساب

تو کیا تم نے یہ فیصلہ کر لیا، میں گنہ گار ہوں
چلومیں نے گردن جھکا دی، اُٹھو میری مُشکیں کسو
چوبِ خشک اور پُر خار سے باندھ کرتُم مجھے ٹانگ دو
کشتنی ہوں تو جو بھی سزا چاہیے، دومجھے
میں معلم نہیں ، درس و تدریس آتا نہیں کچھ مجھے
یک سادہ سا انسان ہوں ، یونہی بے مدّعا ، بے غرض
مرنے سے پہلے ایسی تمنّا نہیں کوئی باقی مری
گر نہ پُورا کرو تم زیاں کار ہو، سب ستم ساز ہو
ہاں مگر صرف اتنا بتا دو مجھے، یہ اساسِ جہاں
سنگِ بنیاد و ہر ایں وآں ، رینگتی زندگی، ہرخوشی
کیا گناہوں پہ قائم نہیں ، جن کا مُرتکب آج ہوں ؟
میں نے اِس آب و ِگل ، آفرینش کا جب جب تصور کیا
میں نے جب جب یہ سوچا کہاں سے یہ سب آ گیااور کیسے ہوا
ہر نئے موڑ پر مجھ کو شیطان و قابیل یاد آئے ہیں !

۳/جون ۱۹۶۲ء

☆☆☆

دعا

اب نہ شو ریدہ سری ہے ، نہ امنگوں کا ہجوم
لب پہ فریاد ، نہ تھرّاتے ہیں پلکوں پہ نجوم
اب نہیں اٹھتا مرے سینے میں آہوں کا دھواں
اب نہیں پڑتا سرِ راہ کوئی ایسا مکاں
جس کی دیوار کے سائے میں سحر گاتی ہو
گوشے گوشے سے جہاں بُوئے چمن آتی ہو
اب نہیں نظریں بھٹکتیں کسی صورت کے لیے
اب نہیں رکتے کسی در پہ عبادت کے لیے
کوئی بیٹھا ہے پس پردہ، نہیں ہوتا قیاس
میں بگولہ ہوں، مجھے اب نہیں ہوتا احساس
میرے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل کا مفہوم
گردشِ خون ہے، باقی ہے ہر اک شے معدوم
میری وہ آنکھیں تڑپتا تھا کبھی جن میں شباب
جو رہا کرتی تھیں اک درد کے مارے بے خواب
آج اِ س واسطے چہرے پہ ہیں ، بینا کہلاؤں
آج اِس واسطے بینا ہوں کہ سب دیکھتا جاؤں
تُم نے میرے لیے جس دن کی دعا مانگی تھی
یہ وہی روزِ قیامت ہے، مبارک ہو تمھیں !

۱۸ر نومبر، ۱۹۵۹ء

☆☆☆

کِرمِ کتابی

یہ میں نے مان لیا تیرا ذہنی سرمایہ
کثیر دولتِ بیدار ہے عزیز ِمن!
یہ میں نے مان لیا تیری تشنگی علم
کچھ اور، اور بھی کچھ ، اور جاننے کی لگن
لیے پھری ہے کتب خانوں میں تجھے دن رات
وہ کرم خوردہ کتابیں ،متاعِ شعر و سخن
وہ قلمی نسخے ، وہ بوسیدہ پارے جنھیں
کبھی ہوا لگی شاید، نہ روشنی کی کرن
لئیم وقت نے جن کو چھپا دیا تھا کہیں
وہ نادرات جنھیں کھا گئی نمی ، سیلن
جنھیں مِلی ہے اماں صرف بند قفلوں میں
وہ گنج ہائے گراں مایہ جانِ فکر و فن
تمام نوکِ زباں پر ہیں، یہ مجھے تسلیم
کیا ہے تو نے انھیں جزوِ روح و جزوِ تن
مگر مجھے ہوامحسوس تجھ سے مِل کر یوں
کہ تو وہ پیلۂ ریشم ہے جس نے اپنا بدن
لپیٹ رکھا ہے کوئے میں ان نوارد کے
یہی کتابیں بنی جا رہی ہیں تیرا کفن
کتاب راہ نما ہے، نہ منزلِ مقصود
یہ صرف نقشِ قدم ہے گزرنے والوں کا

munotes.in

نئے نقوش جنھیں محو کرتے رہتے ہیں
ہمارے ذہنوں سے، ہر روز اک شگوفہ نیا
یہاں پہ کھِلتا ہے، یہ رسم ہے یو نہی تازا
اوسائرسؔ ، نہ زیسؔ ، آج کوئی زندہ نہیں
وہ روز نامچہ مُردوں کا، وہ عمل نامہ
جسے خداؤں نے لکھا تھا کھو گیا ہے کہیں
منو سمرتی، نہ تو ریت ، سب وہ ہنگامہ
بگولہ بن کے اٹھا تھا جو، سوگیا ہے کہیں !
وہ سارے اعلیٰ قوانین جن کو شمسؔ نے خود
کیا حوالے حمورابی کے ، جلال کے ساتھ
تمام دھنس گئے دلدل میں وقت کی، جس کو
قرار ہی نہیں ، اک لمحہ اُڑتا جاتا ہے
یہ رحم کھاتا نہیں آئیسسؔ، نہ اِشترؔ پر
جنھوں نے چاہا محبت کو لا زوال کریں
میں ڈھونڈتا ہوں کہیں ٹکسلا نہ پاٹلی پتر
موہن جودارو ، کہیں قرطبہ ، نہ غرناطہ
نہ نینوا ہے، نہ بابل ، نہ آج اندر پرستھ
یہ سب ہیں میرے لیے گویا خواب کی باتیں
میں ڈھونڈتا ہوں کتابیں جو اُن میں دفن ہوئیں
مگر یہ وقت مرے ہاتھ ہی نہیں آتا
خدا بدلتے ہیں اصنام ٹوٹ جاتے ہیں
تمام عہد و فرامین خوردہ سال ہوئے
اگر ہے زندہ کوئی وقت کی طرح یہ لوگ

یہ لوگ، خامیاں جن کی ہیں تیرے دل کی جلن
یہ لوگ جن کو خدا بننے کی نہیں خواہش
یہ لوگ جن کی شب ماہ ہے، نہ صبح ، چمن
یہ لوگ جن کی کوئی شکل ہے، نہ تا ریخیں
ہنسی میں ڈھال کے جیتے ہیں یو نہی رنج و محن
یہ لوگ ، کم نظر آتے ہیں جو کتابوں سے
یہ لوگ اپنی دعاؤں ، امیدوں کا مدفن
خدائے حاضر و غائب کی ہیں یہ وہ بھیڑیں
جنھیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبر انِ وطن
گزر رہے ہیں سبک گام تیری دنیا سے
جہاں تلاشِ معیشت ہے کربِ دار ورسن
نماز ایک کی ہے، کفر دوسرے کے لیے
کسی کی وجہ سکوں ہے کسی کے دل کی چبھن
کسی کا رزق ، کسی کے لیے پیالۂ زہر
جہاں زمیں نہیں اب تک کسی کا بھی مامن
یہ لوگ، جو ہیں ہر اک فن کا خام سرمایہ
اِنھیں سے باندھا ہے میں نے حیات کا دامن
یہ میں نے مان لیا علم ہے بڑی دولت
اگر کفن نہ بنے یہ تو کیا بُرائی ہے!

۲۸/جون ، ۱۹۶۲ء

☆☆☆

عُمرِ گریزاں کے نام

عُمر یوں مجھ سے گریزاں ہے کہ ہر گام پہ میں
اُس کے دامن سے لپٹتا ہوں مناتا ہوں اُسے
واسطہ دیتا ہوں محرومی و ناکامی کا
داستاں آبلہ پائی کی سناتا ہوں اُسے
خواب ادھورے ہیں جو دہراتا ہوں اُن خوابوں کو
زخم پنہاں ہیں جو وہ زخم دکھاتا ہوں اسے
اُس سے کہتا ہوں تمنّا کے لب ولہجے میں
اے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کے حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مُرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں
یُوں نہ مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ملتوی کرتا رہا کل پہ تری دید کو میں

mumotes.in

اور کرتا رہا اپنے لیے ہموار زمیں
آج لیتا ہوں جو، اُن سوختہ راتوں کا حساب
جن کو چھوڑ آیا ہوں ماضی کے دھندلکے میں کہیں
صرف نقصان نظر آتا ہے اس سودے میں
قطرہ قطرہ جو کریں جمع تو دریا بن جائے
ذرہ ذرہ جو بہم کرتا تو صحرا ہوتا
اپنی نادانی سے انجام سے غافل ہوکر
میں نے دن رات کیے جمع خسارہ بیٹھا
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
اے مرے جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
یو ں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

۱۰؍جنوری،۱۹۶۱ء

☆☆☆

munotes.in

حرفِ تمنّا

خداوند! مجھے اُن کی رفاقت دے
جنھیں رہتا ہے پچھتاوا
کہ جیسی زندگی کی اِس سے بہتر کیوں نہ کر پائے
مجھے اُن کی جسارت دے
جو اپنے نفس کے خادم نہیں ہوتے
برائی کو برائی کہہ کے جیتے ہیں
جو قبروں میں نہیں سوتے
ہوا میں خاک بن کر اُڑ نہیں جاتے
خیالِ روح افزا بن کے آتے ہیں زمانے میں
شمیمِ جاں فزا بن کر زمیں پر پھیل جاتے ہیں
خدا کہہ کر ہر اک شے پوجتا ہوں جز خدا کے مَیں
مجھے توفیق دے سجدوں کے معنی کچھ سمجھ پاؤں
مرے قرطاس کو ایسی عبارت دے
جو دن پر دن
جَلی ہوتی چلی جاتے

۸/مارچ، ۱۹۹۱ء

☆☆☆

munotes.in

خلیل الرحمان اعظمی

یاد

اب بھی دروازہ روز کھلتا ہے
راستہ میرا تک رہا ہے کوئی
میرے گھر کے اُداس منظر پر
کوئی شے اب بھی مسکراتی ہے
میری ماں کے سفید آنچل کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں روتی ہیں
فاصلہ اور کتنی تنہائی
آج کٹتی نہیں ہیں یہ راتیں
آسماں مجھ پہ طنز کرتا ہے
چند تاروں میں ہوتی ہیں باتیں
اے وطن تیرے مرغزاروں میں
میرے بچپن کے خواب رقصاں ہیں
مجھ سے چھٹ کر بھی وادیاں تیری
کیا اسی طرح سے غزل خواں ہیں

☆☆☆

munotes.in

بہار کی واپسی

میں چپ چاپ بیٹھا ہوں اس رہگذر پر
یہی سوچتا ہوں کہ خط لانے والا
کہیں آج بھی کہہ نہ دے کچھ نہیں ہے
یہ کیا بات ہے لوگ اک دوسرے سے
جدا ہو کے یوں جلد ہیں بھول جاتے
وہ دن رات کا ساتھ ہنسنا ہسانا
وہ باتیں جنھیں غیر سے کہہ نہ پائیں
اچھوتے سے الفاظ جو شاہراہوں پہ
آتے ہوئے دیر تک ہچکچائیں
کچھ الفاظ کے پھول جو اس چمن میں
کھلے تھے جسے محفلِ دوش کہیے
جو کچھ دیر پہلے ہی برہم ہوئی ہے
چراغوں سے اب تک دھواں اٹھ رہا ہے
در و بام پر اب بھی پھیلی ہوئی ہے
ہر اک سمت صہبائے احمر کی خوشبو
ہوا میں ابھی شور ہے ہا و ہو، کا
وہ اڑتے ہوئے کاگ کے قہقہوں سے
الجھتے ہوئے زمزمے بوتلوں کے
بناتے ہیں دیوار پر کتنے دھبّے
ابھی ہنس رہے ہیں، ابھی بولتے ہیں

munotes.in

مری داستانوں کے دلچسپ کردار
یہ سنسان گلیوں کے رنگین قصے
یہ سب میرے پیچھے چلے آرہے ہیں
کوئی جیسے روٹھے ہوئے آدمی کو
منائے، بڑے پیار سے تھپتھپائے
دلائے کوئی یاد گزری ہوئی بات
اور ہاتھوں کو اس کے دبا کر کہے
دیکھنا دیکھنا کوئی انجان راہی ہے
یا لڑکھڑاتا ہوا کوئی پتہ
خزاں کے پروں پر اُڑا آرہا ہے
کوئی نامۂ شوق لے آرہا ہے
ترے شہر سرو سمن کے گلوں نے
خود اپنے ہی ہاتھوں سے تجھ کو لکھا ہے
چلے آؤ اب عہدِ گل آگیا ہے

☆☆☆

munotes.in

بن باس

میں کہ خود اپنی ہی آواز کے شعلوں کا اسیر
میں کہ خود اپنی ہی زنجیر کا زندانی ہوں
کون سمجھے گا جہاں میں مرے زخموں کا حساب
کس کو خوش آئے گا اس دہر میں روحوں کا عذاب
کون آکر مرے مٹنے کا تماشا دیکھے
کس کو فرصت کہ اجڑتی ہوئی دنیا دیکھے
کون بھڑکی ہوئی اس آگ کو اپنائے گا
جو بھی آئے گا مرے ساتھ ہی جل جائے گا
وہ گھڑی کون تھی جب مجھ کو ملا تھا بن باس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ وطن سے آیا
لَے کوئی نکہتِ گل اور نہ کوئی موج نسیم
پھر کوئی ڈھونڈنے مجھ کو نہ چمن سے آیا
میں وہ اک لعل ہوں جو بک گیا بازاروں میں
پھر کوئی پوچھنے مجھ کو نہ یمن سے آیا
یاد کرتے ہوئے اک یوسف گم گشتہ کو
کچھ دنوں روئی تو ہوگی مرے گھر کی دیوار
کچھ دنوں گاؤں کی گلیوں میں اُداسی ہوگی
کچھ دنوں کھل نہ سکے ہوں گے مرے ہار سنگھار
کچھ دنوں کے لیے سنسان سا لگتا ہوگا

munotes.in

آم کے باغ میں بے چین پھری ہوگی بہار
میں نے ایک پیڑ پہ جو نام لکھا تھا اپنا
کچھ دنوں زخم کے مانند وہ تازہ ہوگا
میرے سب دوست اسے دیکھ کے کہتے ہوں گے
جانے کس دیس میں بے چارہ بھٹکتا ہوگا
عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
ایک اک کرکے مجھے سب نے بھلایا ہوگا
ہائے اُن کو بھی خبر کیا کہ وہ اک زخمِ نصیب
زندگی کے لیے نکلا تھا جو راہی بن کر
آج تک پا نہ سکا چشمۂ آبِ حیواں
اس کو سورج بھی ملے ہیں تو سیاہی بن کر
گھر سے لایا تھا جو کچھ طبع رواں ، ذہن رسا
ساتھ اُس کے رہے اسبابِ تباہی بن کر
میرا یہ جرم کہ میں صاحب ادراک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکارہوں میں
مجھ کو یہ ضد ہے کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھ کو اصرار کہ جینے کا سزا وار ہوں میں
مجھ کو یہ فخر کہ میں حق و صداقت کا امیں
مجھ کو یہ زعم خود آگاہ ہوں خود دار ہوں میں

munotes.in

ایک اک موڑ پہ آلام و مصائب کے پہاڑ
ایک اک گام پہ آفات سے ٹکرایا ہوں
ایک اک زہر کو ہنس ہنس کے پیا ہے میں نے
ایک اک زخم کو چُن چُن کر اٹھالایا ہوں
ایک اک لمحے کی زنجیر سے میں الجھا ہوں
ایک اک سانس پہ خود آپ سے شرمایا ہوں
یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب کبھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی کچھ بڑھتا ہوا دیکھا ہے
بوند بھر دے نہ سکا کوئی محبت کی شراب
یو ں تو میخانے کا میخانہ لٹا دیکھا ہے

۱۹۵۶ء

☆☆☆

munotes.in

اپنے بچے کے نام

اے مرے سن وسال کے حاصل
میرے آنگن کے نود میدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبح تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو ان فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں
جو مرے نارسا دعاؤں میں
اس طرح مسکراتی ہے جیسے
نغمگی دور کی صداؤں میں
مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا

munotes.in

عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غم فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا

اے مری روح فن کے عکس جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہوسکا وہ تُو ہو جائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
اُن دیاروں میں تیرا نام چلے
۱۹۵۹ء

☆☆☆

munotes.in

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ بھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرامِ جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا۔۔۔۔؟
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا۔۔۔۔۔
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون ہوں۔۔۔۔۔

۱۹۵۹ء

☆☆☆

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو
ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی
کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر سے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
اور ایک اک پیڑ جل کر ہُوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں

munotes.in

جہاں میں ہی میں ہوں

جہاں میرا سایہ ہے

سائے کا سایہ ہے

اور دور تک

بس خلا ہی خلا ہے

☆☆☆

munotes.in

لمحے کی موت

کچھ دور تلک،
کچھ دور تلک،
وہ لمحہ اُس کے ساتھ چلا
جب اُس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں
یہ دھواں
یہ کالی چھتیں
یہ اندھے دیے
سنولاتے ہوئے سارے چہرے
اب اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے
جب نگر نگر کی سیاحی
اِن ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی
آوارہ گردی
ہنستے جسم
کھنکتے پیالوں
کی موسیقی
اس کو راس نہ آئی
اُس نے کہا
اب آؤ لوٹ چلیں

munotes.in

اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اُس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اُس کے بچپن کے
سب کہنے لگے
اُن جگ مگ کرتے شہروں کا
کچھ حال بتاؤ
اپنے سفر کی
کچھ روداد کہو
وہ خاموش رہا
وہ دیکھ رہا تھا اس میلے سے طاق کو
جس پر
اب بھی ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی

☆☆☆

munotes.in

خوابوں سے ڈر لگتا ہے

کل کا سورج اِ سی دہلیز پہ دیکھے گا مجھے
کل بھی کشکول مرا شام کو بھر جائے گا
کل کی تخلیق بھی ہوگی یہی اک نان جویں
کل بھی ہر دن کی طرح یونہی گزر جائے گا

بھوک کی آگ جو بجھتی ہے تو نیند آتی ہے
نیند آتی ہے تو کچھ خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب میں ملتے ہیں کچھ لوگ بچھڑ جاتے ہیں
ان کی یاد اور بھی رہ رہ کے ستاتی ہے مجھے

کل بھی ڈھونڈوں گا اُنھیں جا کے گلی کوچوں میں
کل بھی مل جائیں گے اِن خوابوں کے پیکر کتنے
کل بھی یہ ہاتھ لگاتے ہی بدل جائیں گے
کل بھی پھینکیں گے مری سمت یہ پتھر کتنے

آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی
آج کی رات مجھے خوابوں سے ڈر لگتا ہے

☆☆☆

mjnotes.in

میں اور میں

نیند کی وادی میں لے آئی ہے دن بھر کی تھکن
بسترِ گل سے بھی بڑھ کر ہے ہر اک بسترِ خاک
رات کو لاؤ سبھی روشنیاں گل کردو
جسم بھی سوئے گا اور سوئیں گے ذہن و ادراک

رات تو آئی مگر روشنیاں گل نہ ہوئیں
میرے پہلو میں کوئی آگ سلگتی ہے ابھی
ہر بُنِ مو سے صدا آتی ہے جاؤ جاؤ
ڈھونڈھ کر لاؤ وہ اک شے جو کہیں گم کردی

پا برہنہ میں یونہی گھر سے نکل آیا ہوں
سر کو ٹکراتا ہوں اور زور سے ہوں چلاتا
اے خدا وَ مرا سجدہ مجھے واپس کردو
ورنہ شیطان مرا مجھ کو نہ سونے دے گا

۱۹۶۳ء

☆☆☆

munotes.in

جن راتوں میں نیند نہ آئے

جن راتوں میں نیند نہ آئے
تیرا جاگنے والا آخر
کن باتوں سے جی بہلائے

کتنے اچھے لوگ تھے وہ بھی
ایسی جُدائی کی گھڑیوں میں
تارے گنتے رہتے تھے
جو اک جھوٹے وعدے پر بھی
جانے کیسے کھُلا رکھتے تھے
اپنے گھر کا ہر دروازہ
صبح تلک آنے والے کی
راہیں دیکھا کرتے تھے
اپنے دل کی تنہائی کو
چند ادھورے سپنوں سے ہی
وہ آباد کیے رکھتے تھے
اُن کے برہا کے گیتوں میں
ان کے برہا کے گیتوں میں
جھلمل آنسو کے پردے میں
میٹھے پانی کا چشمہ بھی
دھیرے دھیرے بہتا تھا

munotes.in

تیرے اک جانے پر لیکن
میرا یہ کیا حال ہوا ہے؟
اپنے آپ سے میں روٹھا ہوں
میرا دل خود مجھ سے خفا ہے
میرے کان بھی میری باتیں
مجھ سے آج نہیں سنتے ہیں
گھر میں اتنی تاریکی ہے
آنکھیں ساتھ نہیں دیتی ہیں
سارے روزن، سارے دریچے
سب دروازے بند پڑے ہیں

☆☆☆

munotes.in

munotes.in

munotes.in

munotes.in